# ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۳ شمارہ: ۶

سال اشاعت: مارچ ۲۰۲۰




شعبۂ اردو

ڈھاکہ یونیورسٹی ■ بنگلہ دیش

# ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۳ شمارہ: ۶

سال اشاعت: مارچ ۲۰۲۰

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں

مدیر معاون

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل

مجلس ادارت

ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالرشید

# ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۳

شمارہ: ۶

سال اشاعت : مارچ ۲۰۲۰

ناشر : رجسٹرار، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰، بنگلہ دیش

پریس : بیساکھی کریئشن، ۸۶ پرانہ پلٹن، ڈھاکہ

قیمت : ۱۰۰ ٹاکا (ایک ڈالر)

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰

بنگلہ دیش

ای میل : du.urdujournal@gmail.com

# فہرست


۱۔ عبدالغفور نساخ :حیات وفن

ابوالبرکات جیلانی ۵

۲۔ ڈھاکہ کے چند اردو شعراء

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل ۱۸

۳۔ اردو ادب کی ابتدائی نشو نما میں دکن کی ادبی خدمات کا جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھونیاں ۲۷

۴۔ اقبال کا نظریۂ اشتراکیت

حسین البناء ۳۳

۵۔ ترکی کے اردو دوست خلیل طوقار کی شاعری کا فنی تجزیہ

حفصہ اختر ۴۲

۶۔ بنگلہ دیش میں فروغ اردو میں مدارس کا کردار :مسائل اور امکانات

ڈاکٹر رشید احمد ۵۸

۷۔ اردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا حصہ
ڈاکٹر رضاء الکریم ۶۸

۸۔ ہندوستان میں اکیسویں صدی کے نمائندہ ادبی رسائل
ڈاکٹر ریحان حسن ۸۲

۹۔ غالب کے اردو قصائد۔ایک مختصر جائزہ
ڈاکٹر محمد عالمگیر حسین ۱۰۳

۱۰۔ حسرت موہانی کی شاعری میں سیاسی افکار
محمد غلام مولی ۱۱۰

۱۱۔ صوفی فتح علی ویسی کی شاعری میں اخلاقی اقدار کا تصور
ڈاکٹر محمد منصور عالم ۱۲۳

۱۲۔ عادل شاہی عہد میں اردو ادب: ایک مختصر جائزہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیر الدین ۱۴۰

☆ مقالات کو مصنفین کے نام کے حروف تہجی کی ترتیب سے مندرج کیا گیا ہے۔

# عبدالغفور نسّاخ :حیات وفن

ابوالبرکات جیلانی ☆

عبدالغفور خان نسّاخ نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کی عظیم ادبی ستون میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان میں ایک طرف خوفناک صورت اختیار کررہی تو دوسری جانب ادبی بازارگرم ہورہی تھیں۔ اس دور کی ادبی خدمات کا ذکر نسّاخ کے بغیر ادھوری ہے اگران کا ذکرنہیں کیا گیاتوان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بنگال کا ادبی تذکرہ نسّاخ کے بغیر نامکمل ہے۔نسّاخ نہ صرف ادبی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ ایک افسر کی خاصیت بھی انکے اندر تھی۔وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈپٹی مجسٹریٹ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ادبی دنیامیں جس طرح انہوں نے اپنا ایک الگ مقام وحیثیت بنائی وہی دفتری کام میں انہوں نے اپنا ایک چھاپ چھوڑا ہے۔نساخ ایک بڑے ناقد اور اصلاح کار تھے تو دوسری جانب انکی جہاں جہاں تقریریں ہوئی وہاں سے انہوں نے چورو چکو کا صفایہ کردیا۔نساخ نے اپنی علمی وادبی سفر جاری رکھااور بے پناہ دفتری کام کاج میں مصروف رہنے کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار انجام دیتے رہے۔انکا تبادلہ جہاں جہاں ہوااان کے نئے نئے دوست وشاگرد بنتے رہے۔شعروشاعری کی محفلیں بھی گرم ہوتی رہی۔تصنیف ترتیب،تدوین،ترجمہ کا ذوق ہمراہ گیا۔خود اعتمادی اتنی تھی کہ کسی سے مقابلہ کرلینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔شعری تفکر کے ساتھ ساتھ تنقیدی وتحقیقی شعور میں بھی گرفت رکھتے۔ایک طرف دواوین شائع ہورہے ہیں تو دوسری جانب اردو فارسی شعراء کے کلام کے انتخاب وتذکرے بھی چھپ رہے ہیں۔نصابی کتابیں ترتیب دے رہے ہیں۔شاگردی اور استادی کے رشتے کو بھی خوب نبھایا۔

---

☆ریسرچ اسکالر ، شعبۂ عربی،فارسی،اردو اینڈ اسلامک اسٹڈیز ، وشوبھارتی،مغربی بنگال، انڈیا

مشاعروں کے رونق بنے تو کہیں علمی ادبی معرکوں و مذہبی مناظروں اور مباحثوں میں بھی شامل رہے ۔مقدموں کے فیصلوں پر غور فرماتے ۔چنانچہ نساخ ایک ایسی پُر جہت شخصیت کا نام تھا جس کے اندر تخلیقی بیقراری سمندر کی لہروں کی طرح امنڈ رہی تھی ۔نیڈر نقاد صرف بنگال ہی نہیں بلکہ بنگال کے باہر بھی اپنی ایک پہچان بنا رکھے تھے۔غالبؔ نے جسے ''قلمروئے ہند'' کہا ہے ان کے اندر کوئی تو ایسی بات ہوگی۔کئی زبانوں کا ماہر یہ شخص نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بھی جانا پہچانا جاتا ہے ۔انہوں نے خود اپنی زندگی کے ہر لحات کو مزہ لے لے کر اجاگر کیا ہے۔ان کی زندگی کے حالات خود انکی خودنوشت بیان کرتی ہے جس میں انہوں نے دروغ گوئی سے پرہیز کیا ہے اور اپنی زندگی کے ہر واقع کو دلچسپی کے ساتھ بیان کیا ہے۔مگر وہ نامکمل ہے اسکے باوجود جو بھی تفصیلات انہوں نے پیش کی ہیں ان سے نساخ کی زندگی کے پیشتر گوشے روشن ہو گئے ہیں اور نساخ کے آباوجداد، ان کی زندگی کے ابتدائی حالات ،معاشی تنگی ،سلسلۂ روزگار، احباب، استاد، تلامذ ہوغیرہ کے بارے میں کافی کچھ سرمایہ دستیاب کر سکتے ہیں۔

نساخ کا نام عبدالغفور تھا کنیت ابومحمد، خطاب خان بہادر اور تخلص نساخ ۔اپنے نام کے ساتھ خالدی بھی لکھا کرتے تھے۔بقول نساخ ان کا شجرہ نسب خالد بن ولیدؓ سے ملتا ہے۔اپنے سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ ان کے بزرگ مغل دورِ حکومت میں ہندوستان آئے۔ یہاں انہیں حکومت کی جانب سے جاگریں عطا ہوئیں۔ان کے بزرگوں نے ضلع فرید پور (مشرقی بنگال) میں سکونت اختیار کی۔نساخ نے اپنے خودنوشت میں اپنے اجداد کی ایک مکمل فہرست دی ہے۔خود لکھتے ہیں۔

'' خاکسار عبدالغفور متخلص بہ نساخ ، ڈیپوٹی کلکٹر ڈھاکہ، برادر خود نواب عبداللطیف خان بہادر ، سی ۔آئی۔ای، وزیر ریاست بھوپال، ابن جناب قاضی فقیر محمد مرحوم، مؤلف نسخہ جامع التواریخ وکیل عدالت دیوانی صدر کلکتہ ابن قاضی محمد رضا ابن قاضی محمد سفیع ابن قاضی عبدالشکور ابن قاضی محمد اشرف ابن قاضی عبدالوھاب ابن قاضی عبدالرسول ابن شاہ عبدالدین محمد ابن شاہ، بدیع الدین احمد ابن شاہ احمد ابن محمد قاسم

ابن ابوعبداللہ حسین ابن شمش الدین محمد ابن ابواسماعیل نجم الدین ابن علی ابن عبدالعزیز ابن محمود ابن محمد، ابن عبداللہ ابن ابوعبداللہ محمد ملقب شرف المعالی عمدۃ الدین معروف بہ ابن القیرانی ابن نصر ابن صغیر ابن و اعز ابن محمد ابن خالد ابن نصر ابن واعد ابن عبدالرحمان ابن حضرت مہاجر حضرات سیف اللہ خالد ابن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ "۔[1]

اسطرح نساخ کا سلسلہ نسب اکتیسویں پشت میں حضرت خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔نساخ کے والد مولوی فقیر محمد ۱۸۱۶ء میں تلاش معاش میں کلکتہ آئے یہی نساخ کی پیدائش ۱۲۴۹ھ میں ہوئی۔"بقول نساخ وہ بروز منگل عین نماز عید کے قبل پیدا ہوئے۔ گویا اسلامی تاریخ کے اعتبار سے یکم شوال ۱۲۴۹ ہجری میں پیدا ہوئے[2]۔نساخ کا تعلیمی سفر ساڑھے چار برس کی عمر میں شروع ہوا۔اور شعر گوئی کا شوق سات سال کی عمر سے شروع ہوئی۔نساخ خود لکھتے ہیں۔

"میں سات برس کی عمر سے کچھ کچھ شعر موزوں کرتا تھا۔ان دنوں جو شعر کہے تھے وہ یاد نہیں اور بھی یاد بھی رہنے سے قابل لکھنے کے نہیں تھے"[3]۔ سات برس کی عمر

میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ ہوا۔اسی دوران نساخ کے والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔والدہ کے انتقال کے ٹھیک ستائیس دنوں کے بعد نساخ کے والد قاضی فقیر محمد کا انتقال ۱۲۵۹

میں ہوا۔والد کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نواب عبداللطیف نے اپنے بھائیوں کی پرورش، کی انکی خوردونوش اور تعلیم کی ذمہ داری خوب نبھایا۔سن ۱۸۴۷ء میں نساخ اور انکے بڑے بھائی عبدالباری کو ہوگلی کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل کیا گیا۔ یہاں ان کی ملاقات مولوی رمضان اللہ اور مولوی رشیدالنبی وحشت سے ہوئی اور انکے تلمذ انوں ہوئے۔اس کے بعد اپنے زمانے کے مانے جانے عالم حافظ اکرام احمد صیغم رام پوری کی شاگردی اختیار کرلی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں اس لائق ہوگئے کہ اپنی کلام کی

اصلاح خود کر لیتے اور دوسروں کو بھی اصلاح دینے لگے۔ شعر و شاعری اور تخلیقی سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۸۵۲ء میں ہگلی کالج سے فرعت حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں ڈھاکہ پہنچے۔ یہاں بڑے بھائی عبداللطیف کی مدد سے سیشن جج کے دفتر میں ملازمت ملی۔ پھر صدر دیوانی عدالت میں مترجم ہوئے۔ سن ۱۸۶۲ء میں وہ ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اکثر و بیشتر انکا تبادلہ ہوتا رہا مگر ادبی سلسلے کا مضبوط ڈور کے رشتہ سے بندھے رہے۔ نساخ بنگال کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی جایا کرتے تھیں۔ جہاں ان کی ملاقات بڑے بڑے ادبی شخصیتوں اور امادین شہر سے ہوتی رہی جن میں غالب، آزردہ اور سیفتہ قابل ذکر ہیں۔ غالب کی ایک خط جو نساخ کی ادبی صلاحیتیوں کا عکس پیش کرتا ہے۵۔ مولوی عبدالغفور نساخ سے غالب کی مراسلت کسی، قرابت داری قدیم دوستی یا ہم وطنی کے سبب نہ تھی۔ غالب نے جوہر شناسی کی تھی۔ مولوی صاحب اٹھائیس کتابوں کے مصنف مولف ہوئے۔ زبان وادب کے ایک اہم خادم تھے۔ نساخ عربی، فارسی، اردو اور دوسرے علوم متدولہ کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔۔

نساخ نے جو اپنی بیش ادبی سرمایہ چھوڑا ہے ان میں چار دیوان جس میں **دفتر بے مثال** اولیں دیوان ہے۔ اسکی سال ترتیب ۱۸۶۰ء اور سال طباعت ۱۸۶۳ء ہے جو مظہر العجائب پریس کلکتہ سے طبع ہوا۔ ابتدائی دس صفوں پر مشتمل مولوی نجم الدین حسین نادر یمن سنکھ، مولوی عبید اللہ العبید ی مدنی پوری اور مولوی ریاضت اللہ اوج راقم اخبار دوربین باشندہ پٹڑہ کے فارسی میں تفریظیں ہیں۔ دیوان کے آخری تین صفحوں پر مصنف نے فارسی میں اپنے حالاتِ زندگی اختصار کے ساتھ، اسباب شعر گوئی اور ترتیب دیوان کے متعلق لکھا ہے۶۔ نساخ نے دفتر بے مثال کے اس اڈیشن کا ایک نسخہ مرزا غالب کو بھیجا۔ اس کی رسید میں مرزا غالب نے نساخ کو جو خط لکھا اس میں دفتر بے مثال کی حد تعریف کی ہے۔ نساخ کے غالب کے اس خط کو اپنی دوسری ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کر دیا۔ غزلیں لکھنوی رنگ میں کہی گئی ہیں۔ یہ دیوان ناسخ لکھنوی کے دیوان دفتر پریشان کے جواب میں تصنیف تھا۔

**اشعارِ نساخ** : نساخ کے دوسرے دیوان کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۳ء تاریخ نکلتی ہے۔ یہ دیوان منشی نولکشور پریس لکھنو میں رمضان المبارک ۱۲۹۱ء ۱۸۷۴ء میں طبع ہوا۔ تین صفحوں پر مشتمل تقریظ بزبان فارسی ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد ایک ہزار چھ سو بیاسی (۱۶۸۲) ہے۔ غزلوں کے علاوہ انیس قطعات، ایک قصیدہ ناتمام، آٹھ رباعیاں اور ۳۴ معمیات ہیں جن میں اردو معمیات کی تعداد صرف ۹ ہے۔ ۷۱ منفرق اشعار اور ایک مثلث خواجہ آتش لکھنوی کی غزل پر موجود ہے ۔ ۷

**ارمغان** : نساخ کا تیسرا دیوان ہے اور نام ''ارمغان'' تاریخی۔ ۱۸۷۷ء میں یہ دیوان مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ دیوان کا سالِ ترتیب ۱۲۹۲ھ ہے جیسا کہ خود نساخ نے لکھا ہے ۸۔ اس دیوان میں صرف ۸۵ صفحات تک غزلیں ہیں۔ رباعیات اور ۳ معمیات مرقوم ہیں اور بقیہ صفحے تفریظوں اور تاریخی قطعات پر مشتمل ہے۔ آخری صفحہ پر غلط نامہ درج ہے۔ نساخ کے اس دیوان میں غزلوں اور فردیات کے علاوہ ۹ قطعے ، ۵۰ رباعیاں جن میں ایک رباعی فارسی کی ہے اور تین معمّات ہیں۔ معمی اردو میں صرف ایک ہے اس کے علاوہ نساخ کا فارسی کلام شامل ہے۔

**ارمغانی** : نساخ کا چوتھا اور آخری دیوان ہے جو مطبع نامی لکھنو سے ماہ نومبر ۱۸۸۶ء میں طبع ہوا۔ اس دیوان کا سالِ ترتیب ۱۳۰۲ھ اور اس کا ''ارمغانی'' نام بھی تاریخی ہے۔ اس دیوان کا حجم ۱۱۶ صفحہ ہے لیکن غزلیں اور ابیات صرف ۷۱ صفحات پر مشتمل ہیں اور ۲۸ صفحوں پر محیط مشہور شخصیتوں مثلاً سلاطین، خلفا، نساخ کے متعلقین مشہور شعراء و ادباء ان کے معاصرین اور بعض دواوین کی ترتیب سے متعلق تاریخی قطعات وغیرہ ہیں۔ ۱۸ صفحوں پر مشتمل منظوم تفریظیں و تاریخی قطعات اردو و فارسی میں اس وقت کے شعراء کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دو فارسی معمیات بھی ہیں ۹۔

**چشمہ فیض** : چشمہ فیض فریدالدین عطار رحمتہ علیہ کے "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے گویا انکی یہ نظم انکی فارسی دانی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ترجمہ کا جوفن جوان کے اندر پوشیدہ تھا اسکی عکاشی کرتا ہے۔ چشمہ فیض کا ترجمہ کا مقصد اپنے بڑے بھائی عبداللطیف کے جگر گوشوں کی تربیت کے لئے تحریر فرمائی تھی۱۰۔ اس کتاب کی سال اشاعت ۱۸۷۴ء ہے۔ منشی نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوئی۔ حمد، نعت و مناجات کے بعد منظوم ترجمہ آگے بڑھتا ہے۔ نساخ کے ترجمے میں صفائی ہے۔ غیر مستعمل اور متروک الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے اور زبان صاف ستھری ہے، سادہ اور رواں ہے جو پڑھنے والے کو اپنے جانب کھینچ لیتی ہے۔

**شاہد عشرت** : سراپائے تماشا اس کتاب کا نام ہے۔ سراپائے معشوق کی شاعرانہ تصویر کھینچی ہے۔ سال اشاعت ۱۸۶۴ء میں شاہد عشرت کے سننے کے لئے مٹیا برج میں ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ تقاریظ کے ساتھ ساتھ محبوب کی قامت، دوپٹہ، فرقِ مو، گوہر فرق، زلف، چوٹی، موباف، جبیں، چین، خالِ جبیں وغیرہ کی تعریف ملتی ہے۔ اس تعریف میں نساخ نے خوبصورت تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ خاتمے پر نساخ نے اپنی تعریف خود بیان فرماتے ہیں اسکے علاوہ اپنے استاد رشید النبی وحشت کے گزرنے کا افسوس بھی ظاہر کیا ہے۱۱۔

**مرغوب دل**: مرغوبِ دل نساخ کی فارسی رباعیوں کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ نساخ نے شاہد عشرت جس سال ترتیب دیا اسی سال انہوں نے اپنے فارسی رباعیوں کے مجموعے مرغوب دل کو بھی مرتب کیا۔ مرغوب دل تاریخی نام ہے۔ نساخ اپنی فارسی صلاحیتوں کا مظاہرہ پیش کیا اور یہ ثابت کی ہے کہ وہ انیسویں صدی کے ایک اچھے فارسی گو شاعر بھی ہیں۔ "مرغوب دل" ان کی فارسی رباعیات کا ردیف وار مجموعہ ہے جو ۱۸۸۲ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا۱۲۔

**گنج تواریخ**: گنج تواریخ نساخ کے تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے جو ماہ اکتوبر ۱۸۷۴ء میں منشی نول کشور پریس سے شائع ہوئی۔ شروع اسلام اسے لیکر اس وقت کے مشاہیر اسلام کی تاریخ وفات قلم بند کی ہے۔ یہ تمام

قطعات فارسی میں کہے گئے ہیں ۱۳۔

**کنزالتواریخ** : کنزالتواریخ ایک رسالہ ہے جس میں گنج تواریخ ہی کی طرح تاریخی قطعے اور شعر کہے گئے ہیں ۔اس کا اصلی نام ضمیمہ گنج تواریخ ہے اور تاریخی نام کنزالتواریخ نکلتا ہے ۔۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا اور نظامی کی جانب سے شکریہ مندرج ہے ۱۴۔

بیشتر قطعات فارسی میں ہے۔تین قطعات تاریخ شاہ باغ ڈھاکہ کی تعمیر میں اردو میں کہے گئے ہیں اس کے علاوہ دو قطعات تاریخ اپنے بڑے بھائی نواب عبداللطیف خان کی بیٹی کی شادی اور ایک قطعہ تاریخ ترتیب دیوان جناب خواجہ عبدالغفار رئیس ڈھاکہ مخلص بہ اختر سے متعلق اردو میں ہے۔

**مظہر معما**: یہ رسالہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کا تاریخی نام" مظہر معما" ہے۔مطبع بحرالعلوم لکھنو سے ۱۳۰۲ء اشاعت پذیر ہوئی اور سال ترتیب ۱۲۹۶ء ہے۔اس رسالے میں معموں کی مجموعی تعداد ۳۹ ہے ۲۹ معمے فارسی میں اور دس اردو میں ہے ۱۵۔

**ترانہ خامہ**: ترانہ خامہ نساخ کی اردو رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ترانہ خامہ معروف بہ مرغوب جان۔تاریخی نام ترانہ خامد ہے۔سال ۱۳۰۲ھ میں مطبع بحرالعلوم لکھنو طبع سے ہوئی۔رباعیاں عشق اور لوازماتِ عشق پر مشتمل ہے ۱۶۔

**نصرۃ المسلمین**: نصرۃ المسلمین کا پورا نام رسالہ ردّ وہابی مسمّٰی بہ نصرۃ المسلمین فی الرّد علی غیر المقلدین ہے اور معروف بہ قرع الضالین ہے۔مطبع حامی الاسلام دہلی میں ہوا۔مولوی عبدالمنعم ذوق مدرس عربی و فارسی مطبع ڈھاکہ کالج نے تاریخ طباعت وتصنیف ۱۳۰۳ھ لکھی ہے۔نصرۃ المسلمین میں چالیس صفحوں کے علاوہ علیحدہ سے چار صفحے تفریظ اور قطعہ تاریخ کے لئے شامل کئے گئے ہیں۔اس رباعی کو انہوں نے مسائل حنفیہ پر وہابیوں کے اعتراض کے جواب میں لکھی گئی ہے۔رسالہ "حسب فرمائش" مولوی سید عصمت اللہ مخلص

بہ النسخ شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام فیض الحسن خان نے کیا تھا[۱۷]۔

**باغ وفکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ** : باغِ فکر تاریخی نام ہے اور مقطعاتِ نساخ عرفیت ہے۔ سال ترتیب ۱۳۰۳ھ اور سال طباعت رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ مطابق ماہ جون ۱۸۸۷ء اسکی اشاعت مطبع نامی لکھنو سے باہتمام ابوالحسنات قطب الدین احمد ہوئی۔ اسکے بعد محمد خالد عابدی نے ۱۹۷۷ء میں مرتب کر کے بھوپال بک ہاؤس بھوپال سے شائع کروایا ہے۔ باغ وفکر میں قطعات کی مجموعی تعداد ۱۳۱ ہے۔ اس رسالے میں اشعار نساخ کے ۱۷ قطعے اور ارمغان دیوان سوم کے ۶ قطعے بھی شامل ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے قطعات زیادہ تر عشقیہ ہیں۔ ہجر کی جان کنی ،اور اس کی ابتلا وصل محبوب میسر نہ ہونے کا شکوہ معشوق کی جفا کاریاں، نالہ وفریاد اور فغانِ دلِ ناکام اور بدنام ہو جانے کا خوف وغیرہ کے علاوہ ایک دو نعتیہ قطعے بھی ہے اور بے ثباتی عالم پر بھی ایک قطعہ ہے۔ زبان آسان اور صاف ستھری ہے۔ باغ فکر نساخ کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے[۱۸]۔

**نصاب زبان اردو حصہ دوم (حصہ نظم)** : نصاب ''اردو زبان'' نساخ کا ترتیب دیا ہوا کتاب ہے۔ سرورق پر انگریز کی کچھ تحریر ہیں۔ اس کتاب کو اردو زبان کے امتحان کا نصاب کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ نے ۱۸۶۴ء کے ایل۔ اے کے امتحان کے لئے مقرر فرمایا ہے اسی کتاب کا دوسرا حصہ جس کو مولوی عبدالغفور المتخلص بہ نساخ نے کپتان ولیم ناسولیس کی تصحیح سے چھپوایا۔ یہ نسخہ کلکتہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے لئے چھاپا گیا۔۔ اس کتاب میں ذوق، ظفر، مومن، رند، قبول، سودا اور گویا کی غزلیں اور سودا، ذوق، غالب، مومن اور گویا کے قصیدے شامل ہیں[۱۹]۔

**منتخباتِ دواوین شعراء ہند**:۔ یہ تصنیف اردو کے چند شعراء کی غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ ہے اسے نساخ نے ترتیب دیا اور کیپٹن ولیم ناسولیس نے کالج پریس کلکتہ سے ۱۸۶۴ء میں طبع کرایا۔ اصل میں یہ ''نصاب

اردو حصہ دوم" ہے۔اس کتاب کو بھی ایل۔اے کے امتحان کے لئے ترتیب دیا گیا تھا۔اس کتاب میں بھی ذوق،ظفر،مومن،رند،قبول،سودا،غالب،گویا کے قصائد اور غزلیں شامل ہے۲۰۔

**سخن شعراء** : سخن شعراء اردو شاعروں کا ایک ضخیم تذکرہ ہے۔سخن شعراء تاریخی نام ہے جس سے تاریخ ۱۲۸۱ھ نکلتی ہے۔سال ترتیب ماہ رمضان ۱۲۸۱ھ اور سال چاپ ۱۲۹۱ھ بمطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء ہے۔تذکرہ منشی نول پریس لکھنو سے طبع ہوئی۔جس میں دو صفحوں پر مشتمل تاریخی قطعات ہیں۔سخن شعراء میں نساخ نے اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شاعروں کا مختصر حال بزبان اردو پیش کیا ہے۔یہ نساخ کا ایک اہم کارنامہ ہے ہے جس نے ہندوستان کے بیشتر شاعروں کو گمنام ہونے سے بچالیا۲۱۔

**قطعہ منتخب** : قطعہ منتخب جمادی الاولیٰ ۱۲۹۱ھ بمطابق جولائی ۱۸۷۴ء میں منشی نور لکشور لکھنو سے طبع ہوئی۔۱۲۷۶ھ میں اس کتاب کو ترتیب دی گئی تھی۔۲۵ نساخ نے اپنے قطعہ منتخب میں صرف ان شاعروں کو جگہ دی جنہوں نے قطعہ لکھا ہے۔قطعوں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ شعراء کے مختلف حالات بھی لکھ دیئے ہیں۲۲۔

**تذکرۃ المعاصرین**: اس کتاب کا واحد نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے حبیب الرحمٰن ریر کلکشن میں موجود ہے جس میں ۲۲۳ شعراء کا حال الف ت ع تک ہی موجود ہے۔جس میں اردو لکھ کر اسے اردو کتابوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا مگر میں نے جو اس کو اپنی ہاتھوں سے فارسی لکھا تو وہاں کے لائبریرین کو معلوم ہوا کہ یہ فارسی کی کتاب ہے اس کے علاوہ ایک ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب دستیاب ہوئیں جس میں تذکرۃ المعاصرین لکھا ہوا تھا۔زضا داؤد نام کے کسی شخص نے دستخط کیا ہے اور سرورق پر لکھا ہوا ہے تذکرۃ المعاصرین مولفہ ڈپٹی عبدالغفور نساخ۔اس کے اور ایک کتاب جو اردو اکاڈمی کلکتہ میں موجود ہے اس کتاب کا نام عربی میں ہے ۔التقریظات التی تفضل تمیتھا فحول الادباء الشعرا اہمام البلغا مولوی ابو محمد عبدالغفور خان بہادر

نساخ۔ خدایش اس کے بعد کوئی صفحہ نہیں ملتی لکھا ہے کہ اس کتاب کے بھی کچھ صفحہ کم ہے۔ مصنف کا نام محمد عبدالروٗف وحید اور کتاب غنچہ ارم مطبوعہ کلکتہ سے چاپ ہوئی۔ اس تذکرہ میں نساخ نے جن شعراء کے نام درج کئے ہیں چند واجد علی شاہ، سرسید احمد آہی فارسی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ محمود آزاد، جہانگیر اس کے علاوہ اپنے بھائی عبدالباری جو صید تخلص کرتے تھے ان کا ذکر کیا ہے اور انکی وفات پر ایک قطعہ تاریخ خود رقم کی ہے۔ سخن شعراء اور تذکرۃ المعاصرین دونوں میں موخر الذکر تذکرہ زیادہ مفصل ہے اور کلام پر کہیں کہیں تفصیل سے رائے وغیرہ بھی ہے یہی چیز ظاہر کرتی ہے کہ سخن شعراء کی ضخامت اور زیادہ سے زیادہ شعراء کی شمولیت تفصیل اور رائے میں مانع رہی لیکن یہی بات تذکرۃ المعاصرین میں خارج نہیں رہی۔

ابتدائی ورق اور اختتام کا کوئی نام ونشان ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب نامکمل رہ گئی ہوئی یا پھر دوسرا ایڈیشن کا کام جاری رہا ہوگا۔ اسی دوران نساخ کی وفات ہوگئی ہو۔ اس تذکرہ میں ہندوستان پاکستان کے علاوہ ان شاعروں کا بھی ذکر ہے جو ایران، افغانستان وغیرہ ملکوں سے آکر ہندوستان میں بس گئے تھیں ۲۳۔

**قند پارسی:** قند پارسی جولائی ۱۸۷۲ء مطبع نولکشور سے طبع ہوئی۔ جس میں فارسی گوشعراء، بزرگان، صوفیائے کرام وغیرہ کے فارسی کلام کے انتخاب کو یکجا کر دیا گیا۔ تقریباً دس فارسی گوشعراء کے کلام کو انتخاب درج ہے۔ اس میں کچھ ایسے شعراء کا ذکر ہے جسے دنیائے ادب فراموش کر رہی تھی۔ نساخ نے اپنے تذکرہ کے ذریعہ انہیں پھر سے دنیائے ادب میں شمار کر دیا ۲۴۔

**زبان ریختہ:** زبان ریختہ ۱۶ صفحوں کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو زبان اردو سے متعلق ہے اور مطبع نول کشور لکھنو ۱۸۷۴ء بمطابق جمادی الاول ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوا۔ زبان ریختہ تاریخی نام ہے اور اس سے سال ۱۲۷۵ھ نکلتی ہے۔ رسالے کا پورا نام ''رسالہ در تحقیق زبان اردوئے معلّٰی ہے۔ نساخ نے زبان ریختہ میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ انہوں نے لفظ وضاحت کچھ اسطرح کرتے ہیں۔

''معماروں کے محاوروں میں ریختہ اس مصالحہ کو کہتے ہیں جس کو واسطے استحکام درودیوار کے چند اجز مخلوط کر کے بناتے تھے اور چونکہ زبانِ اردو کے نظم میں بھی الفاظِ عربی مثلِ اللہ و رسول فارسی مثلِ دل و

زبان و ترکی --و --عبرانی --یونانی--وہندی-- وسنسکرت،،،، و تامل--وتلنگو-- وزبان گجرات--وزبان چینی--زبان امریکا کی ترتیب ہے۔اس لئے اس کا نام ریختہ رکھا گیا" ۲۵

نساخ نے شعراء کے اشعار سے حوالہ دے دے کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح اردو زبان میں مختلف ادوار میں مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے گئے۔اس ضمن میں جن شعراء کا کلام درج کیا گیا ہے ان میں احسن، احمد، اشرف، جعفر، خوشنودی، سالک، سعدی، ہاشم، ولی، فطرت، بیدل، عبدالغنی، مومن، ذوق، غالب، ناسخ، آتش اور خود مؤلف یعنی یہ رسالہ نساخ کے کلام سے مثالیں پیش ہونے کے بعد اختتام پزیر ہوتا ہے۔

**انتخاب نقص** : انتخاب نقص بھی ایک ۳۲ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو مطلع نظامی کانپور سے محرم ۱۲۹۶ھ میں اشاعت پذیر ہوا۔نساخ نے اس کتاب میں ناسخ، آتش، امیر لکھنوی، انیس، دبیر جیسے قادر کلام شعراء کے نقص چن چن کر گنوائے ہیں ۲۶۔

**خودنوشت سوانح حیات نساخ** : خودنوشت سوانح حیات نساخ کا نسخہ ایک ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔سن ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر عبدالسبحان نے اسے ترتیب دیا جسے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شائع کیا۔جس میں ڈاکٹر عبدالسبحان کا ایک مقدمہ بزبان انگریزی درج ہے جس سے نساخ کی زندگی اور ان کی خودنوشت کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہے۔بقول عبدالسبحان یہ خودنوشت غالباً ۱۸۸۶ء میں لکھی گئی تھی، کیونکہ اس میں جو واقعات ہے ان میں میں نساخ کے بڑے بھائی خان بہادر عبداللطیف کے وزیر ریاست بھوپال ہونے تک کے واقع قلم بند کیا گیا ہے اور جو ۱۸۸۶ء میں پیش آیا تھا۔ ۲۷

ان کی تمام ادبی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نساخ بیک وقت ایک اچھے شاعر، ایک اچھے تذکرہ نگار، ایک بڑے نقاد، ایک پرہنر سوانح نگار کے اردو، فارسی کے ایک بڑے

خدمت گار کے علاوہ ایک سچے ڈپٹی مجسٹرٹ رہے۔ جہاں بھی گئے وہاں سے بدنظمیں کو ختم کیا اور محنت اور ایمانداری سے فرض ادا کرنے کا درس دیا۔ ان دلیلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نساخ انیسویں صدی عیسوی کے فارسی و اردو شاعری کے جدامجد ہیں۔

## حوالہ جات:


۱۔ مرتبہ عبدالسبحان خودنوشت سوانح حیات نساخ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ص،۱،۲

۲۔ ایضاً ص،۳

۳۔ ایضاً ص، ۹

۴۔ ایضاً ص، ۲،۳،۴،۵،۸،۹

۵۔ ایضاً ص، ۱۰، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۹۳، ۹۴ ، اس کے علاوہ دیباچہ دفتر بے مثال دوسری ایڈیشن

۶۔ ایضاً ص، ۱۸۱

۷۔ اشعار نساخ، سرورق، سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشت تک، مغربی بنگال اردو اکیڈمی طبع سوم جنوری ۲۰۰۲ء ص، ۴۳

۸۔ ارمغان، سرورق، اس کے علاوہ، ڈاکٹر محمد صدرالحق، نساخ (حیات و تصانیف)، ص، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳

۹۔ ایضاً ص، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱

۱۰۔ مرتبہ عبدالسبحان خودنوشت سوانح حیات نساخ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ص،۸۸ اس کے علاوہ سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشت تک، مغربی بنگال اردو اکیڈمی طبع سوم جنوری ۲۰۰۲ء ص،۴۷

۱۱۔ شاہد عشرت، ص،۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۷

۱۲۔ مرتبہ عبدالسبحان خودنوشت سوانح حیات نساخ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ص،۸۸

۱۳۔ سید لطیف الرحمٰن، نساخ سے وحشت تک، مغربی بنگال اردو اکیڈمی طبع سوم جنوری ۲۰۰۲ء ص،۴۶

۱۴۔ ڈاکٹر محمد صدر الحق، نساخ (حیات وتصانیف)، ص، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴

۱۵۔مظہر معما اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد صدر الحق، نساخ (حیات وتصانیف)، ص،۲۱۵

۱۶۔ایضاً ص،۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸

۱۷۔ایضاً ص، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲

۱۸۔محمد حامد علی خان، ہندوستانی ادب کے معمار، عبدالغفور نساخ، ص، ۸۷

۱۹۔ ڈاکٹر محمد صدر الحق، نساخ (حیات وتصانیف)، ص،۲۲۶،

۲۰۔ محمد حامد علی خان، ہندوستانی ادب کے معمار، عبدالغفور نساخ، ص، ۹۷

۲۱۔اتر پردیش اردو اکیڈمی، سخن شعراء

۲۲۔محمد حامد علی خان، ہندوستانی ادب کے معمار، عبدالغفور نساخ، ص، ۳۹

۲۳۔تذکرۃ المعاصرین

۲۴۔قند پارسی

۲۵۔زبان ریختہ

۲۶۔محمد حامد علی خان، ہندوستانی ادب کے معمار، عبدالغفور نساخ، ص، ۱۰۱، ۱۰۲

۲۷۔مرتبہ عبدالسبحان خودنوشت سوانح حیات نساخ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

# ڈھاکہ کے چند اردو شعراء

ڈاکٹر محمد اسرافیل☆

ڈھاکہ نہایت قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ مغل زمانہ ہی سے ڈھاکہ کو ادبی، علمی، ثقافتی، سیاسی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل رہی، سیاسی کشمکش کے باوجود یہاں کے صوبیداروں اور ادب کے شیدائیوں نے یہاں علم و ادب کی محفل سجا رکھی تھی۔ اسی لئے دہلی کے علاوہ ایران اور شمالی ہند میں کشمیر تک کے شعراء اور ادباء کا قافلہ ڈھاکہ کا رخ کرتا رہا۔ انہوں نے یہاں کے ادبی، علمی، ثقافتی ماحول کو جلا بخشی اور دیرپا اثرات چھوڑ گئے۔ ۱

۱۹۷۱ء میں بنگلادیش قیام کے بعد یہاں اردو ادب کے دبستان پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ یہاں کا اردو طبقہ ایک سیاسی اور بحرانی دور کا شکار ہو گیا۔ بیشتر مشاہیر ادب نامساعد حالات سے مجبور ہو کر پاکستان چلے گئے۔ لیکن حالات بڑی ہونے کے باوجود ایسے کچھ ادیب یہاں رہ گئے جس نے مشرقی پاکستان کے زمانے سے یہاں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے اور بنگلادیش کو اپنا وطن مان چکے تھے۔ اس زمانے میں اردو شعر و شاعری کا چرچا کرنا قابل تعریف تھی۔ ان تمام شخصیتوں پر تبصرہ ایک وسیع کام ہے۔ اس لئے ڈھاکہ میں اردو پودوں کو زندہ رکھ کر جن شعراء نے یہاں کے مختلف قبرستان میں دفن ہوئے ان شعراء کا تذکرہ مذکورہ مقالہ کیا ہے۔

**عبدالمعبود عابد دناپوری:** عبدالمعبود عابد دناپوری کا اصلی نام عبدالمعبود ہے، عابد دناپوری ان کا تخلص ہے۔ مشہور اردو شاعر حضرت رضا علی وحشت ان کا شاعرانہ استاد تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر مین دائرہ ادب ڈھاکہ قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس کے بانیوں اور معتمدوں میں سے ایک تھے۔ آپ کا شعری فکر اردو

☆ پروفیسر ، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی ، ڈھاکہ

ادب کی رفتار سے ہم آہنگ رہتا تھا۔ وہ سیدھے سادھے آدمی تھے۔ مشرقی اور مغربی بنگال میں اچھے خاصے متعارف تھے۔ عابد داناپری ۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء میں انتقال فرمائے۔ وہ ڈھاکہ کے عظیم پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

محبت آشنا سارے، مصیبت آشنا گذریی ☆ جو باقی ہیں ابھی ان پر خدا ہی جانے کیا گذرے

جنون رہ روی مقصد سے خالی ہو نہیں سکتا ☆ سمجھ لو اسطرف کچھ ہے، جدھر سے قافلہ گذرے ۲

**عبدالمجید مائل کلکتوی:** عبدالمجید مائل کلکتوی ۱۹۰۱ء میں کلکتہ کے نارکل ڈانگہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ مجیدیہ ہگلی میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ ۱۹۶۴ء میں ڈھاکہ آئے اور میر پور میں رہائش اختیار کی۔ ڈھاکہ میں شعر و شاعری کا چرچا کرتے تھے۔ شاعری میں ان کا استاد تھا جناب محمد سرور خاں صاحب افغانی۔ وہ ۱۹۷۳ء میں وفات پائی۔ ڈھاکہ کے میر پور قبرستان میں ان کو دفن کیا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

اثر لائی ہے کیا آہ دل خانہ خراب الٹا
نکل کر دل ہی سے میرے، کیا دل کو کباب الٹا
مرے آگے رخ انور سے جب اس نے نقاب الٹا
ہوا دل میں سکوں کے بدلے میرے اضطراب الٹا

**خواجہ رئیس الحق رئیس:** خواجہ رئیس الحق رئیس کا تاریخی نام ہے بادشاہ بخت۔ بچپن میں شعر و اشاعری سے گہر اشوق تھا۔ وہ اپنے چاچا مولانا تمنا عمادی کے تلمیذ تھے۔ وہ آخر دسمبر ۱۹۷۳ء مین وفات پائی اور ڈھاکہ کے کلسی مسجد قبرستان میں مدفون ہونے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

انتہا یہ ہے کہ اب اپنا پتہ ملتا نہیں
بانٹتے پھرتے ہیں گھر گھر ڈاک اپنے ہاتھ سے
رہ گیا کاغذ ہی کاغذ ہاتھ میں اپنے رئیس
جانیوالی تھی، گئی املاک، اپنے ہاتھ سے

**وحد الدین نور:** وحد الدین نور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ہمعصروں میں جس کو باصلاحیت سمجھتے، بے تکلف مشورہ سخن کرتے۔ خودداری، خاکساری، خوص ومحبت کا مجسمہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ کلام میں مزاح کی شیرینی کے ساتھ طنز کا زہر بھی شامل رہا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اجتماع میں آپ کی نظمیں ماحول کے تقاضے کی مطابق شعلہ بار اور عوام کے دل کی آواز ثابت ہوتی تھے۔ ہندستان کی شہرہ آفاق شخصیتوں کی قربت حاصل ہوتے ہوئے بھی اپنی نیک دلی اور سادہ طبیعت کے سبب مجبور وشکستہ حال لوگوں میں رہنا پسند کیا۔ وہ جوں ۱۹۷۵ء میں وفات پائی اور عظیم پور قبرستان، ڈھاکہ میں مدفون ہوئے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

کیا ارتقائی جوش ہے دل کی امنگ میں
مصروف قوم ہوگئی ہے ناچ رنگ میں
اب توپ اور گولے کی حالت نہیں رہی
طلبہ ستار جائیں گے میدان جنگ میں

**عبدالسمیع رزمی:** عبدالسمیع رزمی بندر کالونی نارائن گنج میں تھے۔ قیام بنگلادیش کے بعد میر پور چلے آئے۔ وہ خواجہ رئیس الحق رئیس کے تلمیذہ تھے۔ انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۵ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا۔ اس کو میر پور قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ نمونہ کلام:

ربط ملت کا المناک یہ افسانہ ہے
جیسے تسبیح کا بکھرا ہوا ہر دانہ ہے
زر کی چنگی میں سمٹ آتی ہے ساری دنیا
کج کلاہی کا مگر حال گدایانہ ہے
آسمان پر ہے ابھی خر گلستاں کا مزاج
عصمت گل ہوس وحرص کا نذرانہ ہے

**پروفیسر سید ثناء الدین ثناہ:** پروفیسر سید ثناء الدین ثناہ بہت خلیق، بڑے شفیق، انسان دوست تھے۔ قیام بنگلادیش کے بعد بیکاری کے دور میں شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور کار فلاح و بہبود میں پیش پیش رہے۔ ۹ مئی ۱۹۷۶ء میں وہ وفات پائی اور میر پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام:

ذرے ذرے میں ہے اک مہر درخشاں کان نمود
چاند تاروں میں ترا چہرہ زیبا دیکھا
بجلیاں ابر کرم کی تو ذرا برسا دے
عمر بھر ہم نے مقدر کو سلگتا دیکھا
جب کبھی صبح جو چشمے سے نہا کر نکلی
یا خدا ہم نے وہیں تجھ کو سراپا دیکھا

**بابو حسن خان یاس:** بابو حسن خان یاس بہت خلوص انسان تھے۔ شعر سخن کی محفلیں آپ کے دم سے زندہ رہتی تھیں۔ قیام بنگلادیش کے بعد میمن سنگ سے ڈھاکہ میر پور آئے اور وہاں رہائش اختیار کی۔ یکم جولائی ۱۹۷۶ء میں انتقال کیا اور میر پور قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام:

دائرے روشنی کے منور تو ہیں خون کا رنگ چھلکے تو کچھ بات
ہم شفق کے پجاری، ہمیں کیا غرض خوبصورت اگر چاندنی رات ہے
ہم کو انساں کی عظمت سے مطلب نہیں شیطنیت ہے رقصاں ہمیں کیا غرض
پیکر حسن و اخلاق ڈھالینگے ہم جیت جوش جنوں ہے خرد مات ہے۔

**شمیم احمد شمیم:** شمیم احمد شمیم کم عمر ہونے کے باوجود شعر کہنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ حافظ دہلوی ان کے شاعرانہ استاد تھے۔ قلمی رسالہ ''تماشہ'' ڈھاکہ کے معاون تھے۔ شاہراہ گلستان پر حادثے کی زد میں آئے اور میڈیکل ہسپتال ڈھاکہ میں دار فانی سے کوچ ہے۔ ان کے دوست حصیر نوری نے ہندو پاک اور بنگلادیش کے ادیبوں سے مرحوم پر مضامین لکھوا کر ایک کتاب 'دیدہ تر' کے نام سے ترتیب دیکر شائع کی۔ حصیر نوری

نے یہ کام انجام دیکر اپنی بچپن کی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ شمیم ۱۸ دسمبر ۱۹۷۶ء ڈھاکہ میں انتقال کئے اور محمد پور قبرستان میں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام:

آئے آرزوئے رنگ و بو مجھ کو معاف رکھ
پھولوں کو رو رہا ہوں میں فصل بہار میں

---

میں اپنے شہر میں ہوں آج اجنبی کی طرح
غم حیات گل دوستی کھلانے دے

**عبدالرحمان آصف:** عبدالرحمان آصف استاد الاساتذہ حضرت رضی علی وحشت کلکتوی کے قابل فخر تلامذہ تھے۔ مرحوم سلیم اللہ فہمی ان کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> آصف بنارسی وحشت مرحوم کے بزرگ ترین شاگرد ہیں۔ استاد کا رنگ ان کی انفرادیت سے ہم آہنگ ہو کر دو آتشہ بن گیا ہے۔ اردو کا کلاسیکی تغزل ان کی ہر غزل میں بڑے حسن انداز میں موجود ہے۔ ۳

آپ شاعری میں بلبل ہندوستان داغ دہلوی اور خدائے سخن غالب کے مقلد تھے۔ آپ کے یہاں داغ کے انداز بیاں، بے تکلفی و شوخی، تراکیب و بندشوں کا بے ساختہ استعمال بخوبی نمایاں ہے۔ استادانہ حیثیت کے مالک تھے۔ اس زمانے میں مشرقی پاکستان میں شعراء کا ایک خاص حلقہ آپ کے دامن فیض سے وابستہ تھا۔ آپ زبان کی صحت مندانہ روایات اور قواعد پر سختی سے پابند تھے اور کبھی بھی ان میں غیر ضروری تصرف سے کام نہیں لیا۔ آپ کی ادارت میں ماہانہ رسالہ ''انگڑائی'' کلکتہ ۱۹۴۶ء میں نکل رہا تھا۔ آپ کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ اکثر بزرگ تلامذہ بھی ابا کہا کرتے ہیں ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء میں ڈھاکہ میں انتقال کیا اور عظیم پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام:

ملی تھی خضر کو جو شے حیات جاوداں ہو کر
ترے عاشق نے پائی ہے وہ مرگ ناگہاں ہو کر
عیش ماضی کا تصور بھی ہے خوش کن لیکن
تو جسے بھول گیا ہو وہ کسے یاد رہے۔ ۴

**امیر الاسلام شرقی:** امیر الاسلام شرقی بھی استاد الاساتذہ حضرت رضی علی وحشت کلکتوی کے تلمیذ تھے۔ ان کے آبائی وطن بنگلادیش کے کومیلا ضلع میں ہیں لیکن وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ اپنی بی بی کے ساتھ گہرا محبت تھی۔ کم سنی کی عمر میں بی بی کے انتقال کی وجہ سے ان کا دل ہر وقت اداس رہتا تھا۔ دوست احباب کی کو ششوں سے محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ مشاعرہ طرحی ہو یا غیر طرحی یا ریڈیو پر سنانا ہو ہر اشعار مرحومہ کی یاد میں ہوتے تھے اور یہی کہ کر سناتے تھے۔ ان کے نمونہ کلام:

آئے وہ میرے خواب میں آ کر چلے گئے
سویا ہوا نصیب جگا کر چلے گئے
کیوں آئے اور کس لئے آ کر چلے گئے
یہ راز تھا تو کیوں نہ بتا کر چلے گئے
ہر تار ساز دل کا ابھی تک ہے مضطرب
میرا ہی نغمہ مجھ کو سنا کر چلے گئے۔

**رضا احمد رضا:** رضا احمد رضا کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ قیام بنگلادیش کے بعد ڈھاکہ چلے آئے۔ اس شہر کی پیار میں موت تک یہاں رہ گئے۔ شاعری میں حضرت رضا علی وحشت ان کے استاد تھے۔ نہایت پر خلوص و محبت والے انسان تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں وفات پائی اور میر پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام:

زخم پر دے زخم، قاتل ایک اور
مضطرب ہے خواہش دل ایک اور
جی نہیں لگتا کہیں منزل پہ اب
ڈھونڈتا پھرتا ہوں منزل ایک اور
دل کا غم دل کو دکھا سکتا نہیں
چاہتا ہوں دیدہ دل ایک اور
بزم جاناں میں غزل پڑھ کر رضا
دیکھتا ہوں رنگ محفل ایک اور ۵

**شیخ امن الرحمان اشک طوطی:** شیخ امن الرحمان اشک طوطی بنگلادیش کے نام میں معروف ومشہور تھے۔ ہر صنف شاعری میں دخل تھا مگر غزل زیادہ کہتے تھے۔ نہایت پرخلوص ومحبت بھرا دل رکھتے تھے۔ انسان دوستی کے رشتے کو مضبوط رشتہ سمجھتے تھے اور ہمیشہ حق کا ساتھ دیتے تھے۔ ڈھاکہ ٹونگی نشاط نگر دور شریف خانقاہ سنجری محفل میں آپنے پیرومرشد اعلی حضرت بابا شاہ سراج الاسلام چشتی بغدادی کے روبرعرس کے موقع پر عوامی اجتماع میں اپنی نعت شریف نہایت خوش لحن میں پڑھ رہے تھے کہ ایک شعر پر پیرومرشد بابا نے بے ساختہ فرمایا جزاک اللہ طوطی بنگلادیش، جزاک اللہ طوطی بنگلادیش۔ نعت کا ہر شعر پڑھواتے رہے۔ عرس کے بعد بابا کیت عطا کردہ خطاب پر پیر بھائیوں نے مبارک باد دی۔ بزرگ مریدوں کی درخواست کی وجہ سے خانقاہ کی طرف سے تحریر کی صورت میں بطور سند دیا گیا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام 'روح شاعر' ۱۹۶۷ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ ۱۶ مئی ۱۹۸۰ء میں وفات پائی اور ڈھاکہ عظیم پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے نمونہ کلام:

رازداران محبت کی زبان کھلتی نہیں
اس لئے دنیا پہ رمز داستان کھلتی نہیں
تابکے گم گشتہ راہی، تابکے عزم سفر

ہم سے یہ گتھی امیر کا رواں کھلتی نہیں
ایک دنیا منتظر ہے دعوت دیدار کی
کیوں نقاب رخ تری اے جان جاں کھلتی نہیں
آ کے بیٹھے وہ ہمارے حلقہ احباب میں
جس کی قسمت اشک زیر آسمان کھلتی نہیں۔ ۲

**ظہیر الحسن ظہیر:** ظہیر الحسن ظہیر حافظ دہلوی کے شاگرد تھے۔ حلقہ فکر و دانش بنگلا دیش کے خزانچی تھے۔ وہ اس انجمن میں اچھی حیثیت رکھتے تھے۔ حلقے کے مشاعروں کے اچھے منتظم تھے۔ ان کا شعر کہنے کا سلیقہ خوب تھا۔ حلقہ فکر و دانش کے شائع کردہ کتاب 'نجم و شرر' میں ان کا کلام موجود ہے۔ وہ ۷ جولائی ۱۹۸۱ء میں وفات پائی اور ڈھاکہ کے میر پور قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے کلام کا نمونہ:

رہنمائی جو آپ کے ہوئی ☆ ہم بھی منزل کو پا گئے ہوتے
مضطرب دل سکون پا جاتا ☆ تام جو ہمت بڑھا گئے ہوتے
زندگی میری گنگنا اٹھتی ☆ تم جو نزدیک آ گئے ہوتے
راہ منزل میں روشنی کیلئے ☆ کاش بجلی گرا گئے ہوتے

**سید ارتضی حسین خطیب:** سید ارتضی حسین خطیب حضرت مولانا تمنا عمادی اور اپنے والد اثر رودلوی کے شاگرد تھے۔ نہایت ہی خلیق آدمی تھے۔ باتیں بہت رسیلی ہوتی تھی۔ شعر و شاعری کے سلسلے میں کبھی کسی سے تنازعہ نہیں کیا اگر ایسا موقع آیا بھی تو اپنی بہ شکست تسلیم کر لیتے۔ صلح و صفائی کے معاملے میں آپ جیسا کوئی شاعر نظر نہیں آئی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء میں انتقال فرمائے اور ڈھاکہ عظیم پار قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے نمونہ کلام:

یہ چند لمحے ہیں، آؤ کہ جا وداں کر لیں
تمہارا حسن، ہماری نظر رہے نہ رہے

تجھے کو تیرے تغافل سے مانگتا ہوں میں
پھر اس کے بعد دعا میں اثر رہے نہ رہے
یہ ناز حسن سلامت، یہ کیف غم آباد
وہ میرے حال سے پھر باخبر رہے نہ رہے
سمجھ لو، دیکھ لو، رنگنیاں زمانے کی
خطیب چشم حقیقت نگر رہے نہ رہے۔ ۸

ڈھاکہ میں بہت سے اردو شعرا مشہد عام پر آئے اور شہرت تاج ان کے سروں پر رکھا گیا۔ شاعری کی متعدد اصناف میں ان کے دارنامے یادگار زمانہ ہے۔ اردو شاعری کو ان کی تصنیفات سے چار چاند لگ گئے۔

## مأخذ و منابع:


۱۔ پروفیسر کلثوم ابوالبشر، بنگلا دیش میں اردو ادب، بنگلہ اردو ساہیتہ فاونڈیشن، اپریل ۱۲۱۵ء، ص۔ ۲۹
۲۔ پروفیسر ڈاکٹر اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص۔ ۳۸۸
۳۔ ماہنامہ وجود، ڈھاکہ، ۱۹۸۸ء، ص۔ ۱۱۳
۴۔ ماہنامہ وجود، ڈھاکہ، ۱۹۷۷ء، ص۔ ۲۰
۵۔ ہفتہ وار دہراپل، ڈھاکہ، ۱۹۷۹ء، ص۔ ۱۵
۶۔ ماہنامہ وجود، ڈھاکہ، ۱۹۸۷ء، ص۔ ۲۴
۷۔ ماہنامہ وجود، ڈھاکہ، ۱۹۸۴ء، ص۔ ۱۱۹
۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۲۰

# اردو ادب کی ابتدائی نشو نما میں دکن کی ادبی خدمات کا جائزہ

ڈاکٹر جعفر احمد بھونیاں ☆

اردو ادب کی تاریخ میں دکن کی اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دکنی زبان بھی اردو کے مانند فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی طرح دکنی زبان میں بھی فارسی کے الفاظ زیادہ نہیں ہیں۔ ۱

جب سلطان علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کیا تو انہوں نے تمام مسلماں افواج، علماء اور اہل قلم کو دکن جانے کا حکم دیا۔ اسی وقت مسلمان اپنے ساتھ اپنی فارسی نما اردو زبان کو بھی ساتھ لے گئے۔ اسی وقت سے دہلی کے ساتھ دکن میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا۔ جسکے نتیجے میں دلی والوں کی کھڑی بولی اور دکن کی ڈراوڈی زبان آپس میں ملکر ایک مخلوط زبان پیدا ہوگئی۔ اسی مخلوط زبان کو دکنی اردو کہا جاتا ہے۔ ۲

دکنی اردو ادب کی نشو نما میں جنہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں خاندان بہمنی کے شعراء و ادباء قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کا بانی برمن گنگو تھا۔ برہمنی خاندان کے اردو ادب کا زیادہ تر سرمایہ مذہبی تھا کیونکہ اہل قلم اکثر صوفی اور درویش تھے۔ برمنی خاندان کے لکھنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

**(۱) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز:**

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ دہلی کے مشہور صوفی فقیر نظام الدین اولیاء کے خلیفہ خواجہ نصر الدین چراغ دہلوی کے سب سے زیادہ اہم شاگرد اور خلیفہ تھے۔ ۳

بندہ نواز گیسو دراز بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی اور عربی میں ان کی کئی کتابیں مشہور ہیں۔ اور

---

☆ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ

عام لوگوں کے لئے وہ اپنے خیالات اردو میں ظاہر کرتے تھے۔لوگوں کی آسانی کے لئے انہوں نے جو کچھ لکھا اردو ہی میں لکھا۔لیکن قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی اردو یا دکنی زبان میں ان کی کتنی کتابیں

ہیں۔مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کو اردو کی پہلی نثری کتاب کہا ہے۔اس کے دکنی قلمی نسخے موجود ہیں مگر عبارات میں بہت فرق ہے۔اس کے علاوہ گیسودراز کی اور دو چھوٹی چھوٹی کتابیں ملتی ہے۔شکارنامہ اور تلاوۃ الوجود ان میں پہلی کتاب شائع بھی ہو چکی ہے۔تقریباً آٹھ کتابیں ان کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔گو ان کے وجود کا پتہ کم ہے۔۴

(۲)عبداللہ حسینی

گیسودراز کے پوتے عبداللہ حسینی بھی ایک مشہور صوفی تھے۔انہوں نے مشہور کتاب نشاۃ العشاق کا ترجمہ اردو میں کیا۔اس زبان میں نظامی نے ایک کتاب کرم داد پدم راؤ لکھی۔اسطرح اردو ادب کی ابتدا ہو گئی۔مگر اسی کی واقعی ترقی بیجاپور اور گولکنڈہ کی کبیر تلسی اور سور کے چمکے کا ہے۔جسکے اظہار خیال کی زبانی اور بھی اور برج تھی۔کھڑی بولی اپنے علاقے سے نکل کر اس وقت کچھ تاریخ حالات کے سازگار ہونے کی وجہ سے جنوبی ہند میں اپنے لئے ایک جگہ تیار کی تھی۔دکن میں اردو ادب کا فروغ ہوا تھا۔اس میں جس تہذیب کا رنگ جھلکتا ہے اس پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ تھی۔وہاں کے شعراء کی تخلیقات مقامی رنگ سے مالا مال ہیں۔۵

۳۔میران جی

میران جی شمس العشاق نے اپنی مثنوی میں حسن و عشق کے قصے اور واردات قلب کی داستانیں دہرائی ہے۔وہ ۱۵۷۳ء تک زندہ تھے۔انہوں نے اپنی زبان کو ہندی کہا ہے۔ان کی تخلیقات میں بھی سرف عشق،تصوف،یا مذہب کی باتیں ہی نہیں بلکہ ادبی نظر سے ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ان کی مثنوی میں شہادت الحقیقت خوش طبع مشہور ہے۔۶

۴۔شاہ برھان الدین جانم

جانم میران جی کے فرزند تھے۔ان کی مثنوی کا موضوع سادہ اور سلیس ہے۔وصیت الھادی،نور الواصلین، بشارۃ الذکر اور ارشاد نامہ نا کی قابل ذخر تصانیف ہیں۔۱۵۹۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔وہ غزل بھی لکھتے تھے۔ان کے کلام میں فارسی اور عربی الفاظ بہت کم ہے۔

۵۔ابراہیم عادل شاہ ثانی:

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۶۲۶ء۔۱۵۸۰ء ہے۔وہ صرف دکنی زبان اور اسکی شاعری ہی سے محبت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ ہندوستان کے فنی موسیقی میں بھی کامل تھا۔

۶۔نصرتی

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔وہ علی عادل شاہ بادشاہ کی درباری شاعر تھے۔ان کے کلام انسانی جذبات اور خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ان کی تصانیف میں گلشن عشق،علی نامہ اور تاریخ اسکندری ہے۔

۷۔ہاشمی

ان کا اصل نام سید میران ہے۔ہاشمی ان کا تخلص ہے۔وہ ہمیشہ غزل لکھتے تھے۔ان کا ایک دیوان موجود ہے۔ان کی ایک مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔انہوں نے ۱۶۹۱ء میں انتقال کیا۔ ۷

۸۔قطب شاہی دور

سلطان قلی قطب شاہ اس دور کا پہلا بادشاہ ہے گولکنڈہ کے بادشاہ تھے۔اس دور کے اکثر سلاطین خود شاعر تھے۔اور شاعری کے سرپرست تھے۔گولکنڈہ میں قطب شاہی کی بدولت اردو کی بڑی ترقی ہوئی۔۸

۹۔محمد قلی قطب شاہ :۔

اردو کے عظیم الشان شاعر تھے۔ان کا اسلوب بیان نہایت سادہ اور عبارت سلیس ہے۔ان کی

شاعری میں مقامی رنگ زیادہ ہے ان کی غزلوں میں لطافت اور عاشقانہ عنصریت کافی ہے۔ وہ مرثیے، غزل اور مثنوی سب ہی لکھتے تھے۔ کلیات قلی قطب شاہ ان کا شعر کا مجموعہ ہے۔۹

۱۰۔ محمد قطب شاہ:۔

وہ محمد قلی کا بھتیجا تھا۔ وہ بھی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں مقامی رنگ ہے۔ وہ کل اللہ تخلص اختیار کرتے تھے۔ وہ بڑے علم دوست تھے۔ اور اہل کمال کے سرپرست تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

۱۱۔ ملا وجہی

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں وجہی نہایت معزز، بلند پایہ شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں۔ وجہی نے نثر میں سب رس کے نام سے ایک لاجواب تصنیف چھوڑی ہے۔ اس میں تصوف کے پر معنی اور طبق خیالات تمثیلوں اور علامتوں کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔

وجہی دکنی دور کا ایک باکمال شاعر اور ادیب ہے۔ نظم میں باب مشتری اور نثر میں سب رس اردو ادب کے شہ بارے میں۔ خصوصاً سب رس اردو ادب کی ابتدائی تاریخ کے سلسلے میں ان کی زبان ترقی یافتہ تھی تاہم اس کا اسلوب ایک ترقی یافتہ صورت کا قابل ہے۔ الغرض وجہی موجودہ معلومات کے مطالعہ قدیم اردو ادب کا پہلا مصنف ہے جسنے نظم و نثر کو کھلا ملا کر فارسی اسلوب کی طرز پر اردو میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد قائم کی۔ اسلوب اردو ادب کی تاریخ میں ان کا ایجاد ہے۔۱۰

۱۲۔ ابن نشاطی:۔

قطب شاہی عہد کا تیسرا بڑا اردو شاعر ابن نشاطی تھا۔ اسکی مشہور مثنوی پھول بن ہے۔ جو دکنی اردو کے خزینہ ادب کا ایک انمول رتن سمجھی جاتی ہے۔

۱۳۔ولی:

ولی کو ایک زمانے تک اردو شاعری کا بابا آدم کہا گیا۔ولی کا نام ولی محمد تھا۔

ولی کا دیوان متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔یہاں تک کہ مشہور فرانسی عالم گارسان دیاسی نے بھی ان کا دیوان فرانسیسی سے شائع کیا تھا۔ولی نے غزل،مثنوی،قصیدہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہیں۔

۱۴۔قاضی محمد بحری

بحری ایک بڑے سوفی شاعر مانے جاتے ہیں ان کی ایک مثنوی جس کے موضوع مسلک صوفیاء کے اسرار کا پھیلنی ہے۔ان کی مشہور تصنیفات میں من لگن اور عروس عرفان ہیں۔

۱۵۔سراج

سراج اور رنگ آبادی اس زمانہ کے تیسرے بڑے شاعر تھے ان کا مولد اور رنگ آباد تھا۔اردو کے صوفی شعرا میں سراج کو بہت اہم مقام دیا جاتا ہے۔

قراری اور جوش کا پتہ چلتا ہے ان کے مجموعہ میں ہر قسم کی نظمیں ملتی ہے۔مگر یہ ہے کہ وہ اپنی مثنوری بوستان خیال اور اپنی غزلوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسویں میں شمالی ہند کی نسبت دکنی میں اردو ادب کی خدمات زیادہ نمایاں ہیں۔

حوالہ جات :

۱۔حامد حسین قادری۔داستان تاریخ اردو۔اردو اکاڈمی۔کراچی حیدر آباد،لاہور پاکستان ۱۹۷۱ء۔صفحہ ۳۶

۲۔نصیر الدین ہاشمی،دکن میں اردو،مکتبہ معین الادب اردو بازار،لاہور،صفحہ ۲۵

۴۔رام بابو سکسینہ،تاریخ ادب اردو،ممبر ہندوستان اکیڈمی یو پی۔کلکتہ،صفحہ ۵۵

۵۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، مکتبہ معین الادب اردو بازار، لاہور، صفحہ ۷۷
۶۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ دکنی ادبی تاریخ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، صفحہ ۵۷
۷۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اردو، مکتبہ معین الادب اردو بازار، لاہور، پاکستان، صفحہ ۳۴
۸۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ دکنی ادبی تاریخ، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، صفحہ ۱۷
۹۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان، مضمون بعنوان دکنی یا اردو شووزبان ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۷
۱۰۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکاڈمی ۱۹۶۶ء، کراچی، حیدرآباد، لاہور، پاکستان۔ صفحہ۔ ۴۵
۱۱۔ مرزا محمد عسکری، تاریخ ادب اردو، راجہ رام کمار پریس، وارث نول کشور پریس بکڈپو، لکھنو، صفحہ ۶۵

# اقبال کا نظریۂ اشتراکیت

حسین البناء ☆

کمیونزم اور سوشلزم کا اردو لفظ اشتراکیت ہے۔ جس کا معنی ہے پیداوار کے ذرائع اجتماعی اور سرکاری ملکیت میں رکھنے کے ہیں اور یہ بھی اسکے معنی میں شامل ہے کہ ہر شخص سے اسکی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور معاوضہ محنت کے مطابق ادا کیا جائے۔ روس کے کارل مارکس دنیا کے سرمایہ دار جابرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی اور مزدور کی حمایت میں نعرہ لگایا۔ لینن اور انکے حامیوں کے ذریعہ کمینوزم اور اشتراکیت طوفان کی طرح پوری دنیا پر چھا گئی۔ علامہ اقبال کمینوزم کو بڑی بارک بینی سے مطالعہ کیا اور اسلامی فلسفہ و حیات کی روشنی میں اس نظام اس نظام کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی پہلوں کا جائزہ لیا۔ اقبال سے متعلق اشتراکیت کی خبریں اس وقت زیادہ گرم ہوئیں جب روز نامہ ''زمین دار'' میں اقبال کو صرف اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا حامی اور مبلغ قرار دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ موضوع زیر بحث ہے کہ اقبال اشتراکی اور کمینونسٹ تھے یا نہیں؟ دراصل علامہ اقبال اشتراکی نہیں تھے البتہ اشتراکیت سے کافی متاثر تھے اور مذہب اشتراکیت کو نہیں بلکہ اشتراکیت کے اقتصادی نظام کو خوش آمدید کہا۔

یہ بات بھی صحیح ہے کہ انقلاب روس کا خیر مقدم کرنے والے ہندوستانی شاعروں میں علامہ اقبال کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ہندوستان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے روس کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور پور جوش انداز میں انقلاب کے نغمے گائے۔ علامہ اقبال اپنی نظم ''خضر راہ'' میں کہتے ہیں۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

---

☆ اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب ، رنگ
''خواجگی ''نے چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کے چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہاے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کے اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے۔(۱)

اس نظم میں علامہ اقبال نے سرمایہ داروں کے پوشیدہ رازوں سے پردہ ہٹا کر کھول کھول کر مزدوروں کو بتلادی ہے کہ کس طرح یہ سرمایہ دار مزدوروں کو اپنا غلام بنا کر رکھے ہیں اور مزدوروں کا خون پی رہے ہیں اور اپنی مکارانہ چالوں سے مزدوروں کو اپنا غلام بنانے کے لیے مختلف قسم کے پھندے تیار کئے ہیں۔ لیکن اے مزدور! اب جاگو ابھی غفلت کا وقت نہیں ہے اور اپنے حق کے حصول کے لیے برسر پیکار ہو جاؤ۔

اقبال کے نزدیک بنیادی طور پر مزدور کے حق کے بارے میں اشتراکیت کی تعلیم وہی ہے جو اسلام کی ہے۔ مارکس صرف تجربے کی بنیاد پر مزدوروں کے حقوق کی آواز اٹھائی اور کہا کہ: مزدوروں کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ

اگر سیٹھ صاحب مجھے کچھ نہ دے تو ہم مر جائینگے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مزدور اسکی فیکٹری میں کام نہ کرے تو اسکی فیکٹری بند ہو جائینگی۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ساقی نامہ'' میں کئی جگہ انتہائی مسرت کے ساتھ عوام الناس کو سرمایہ داری کا دور ختم ہونے پر مبارک باد دے کر یہ بات بتائی:

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ھمالہ کے چشمے ابلنے لگے(۲)

اس نظم کی دوسری جگہ علامہ اقبال انسان کو غلامی سے چھٹکارہ دلانے کے لیے کہتے ہیں

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر(۳)

علامہ اقبال اتنی تیزی سے چاہتے تھے کہ سب کچھ ایک لمحہ میں بدل جائے۔ انسانوں کے درمیان جو پردہ ہے وہ ہٹ جائے اور ہر فرد و بشر ایک ہو جائے۔ نہ کوئی غریب ہو نہ امیر، نہ غنی ہو نہ مفلس بلکہ معاشی اعتبار سے سب لوگ برابر ہوں۔ اس لیے علامہ اقبال کہتے ہیں:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے(۴)

یہاں ملاحظہ کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال لادین اشتراکیت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد فرماتے ہیں کہ: ''اقبال کی شاعری میں روحانی اشراکیت پسندی موجود ہے''۔ ڈاکٹر جمیل احمد کے خیال میں علامہ اقبال کی روحانی اشتراکیت اور کارل مارکس کی مادہ پرست اشتراکیت میں آسمان و زمین فرق

ہے۔(۵)

پھر بھی علامہ اقبال انقلاب روس کو استقبال کرتے ہوئے اسے نئی زندگی سے تعبیر کیا۔ یہاں پر علامہ اقبال کا ایک اقتباس ذکر کرنا غیر مناسب نہ ہوگا جو علامہ اقبال نے اپنی کتاب ''پیام مشرق'' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی۔ جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا۔ اور آب تہذیب وتمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اسکے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا ہوگا''(۶)

سرمایہ دار اور مزدوروں میں تقسیم جائداد کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

غوغائے کار خانہ آہنگری زمن
گلبانگِ ارغنون کلیسا ازان تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد زمن
باغ بہشت وسدرہ وطوبی ازانِ تو(۷)

یعنی اس دنیا میں جو کچھ ہیں کوئلہ، لوہا، پتھر، جواہرات، سونا، چاندی، تیل، پٹرول وغیرہ کو سرمایہ دار نے اپنی ملکیت شمار کیں اور زمیں سے لے کر آسمان بلکہ عرش عظیم تک ساری کائنات مزدوروں کی ملکیت میں دے دی۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے سرمایہ داری کی ذہنیت کو اجاگر کیا ہے اور انقلاب روس کی داستان بیان کیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ سرمایہ دار ظالموں کا دن آج ختم ہو چکا ہے اور محنت کش اپنی حکم رانی قائم کرنے کے لیے میدان کارزار میں اتر آئے ہیں۔ آب ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے اور ایک نئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اقبال اپنے ہم وطنوں کو نیند سے جگانے کے لیے کہتے ہیں کہ آج زندگی ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے اگر تم نے عقل سے کام نہ لیا کرو تو بہت پیچھے رہ جاؤں گے۔ نیز ''نوائے مزدور'' میں علامہ اقبال کہتے ہیں

ز مزد بندۂ کرپاس پوش محنت کش

نصیب خواجہ ٔ نا کردہ کار رخت حریر
ز خوے فشانی من لعل خاتم والی
ز اشک کودک من گوہر ستام امیر
ز خون من چوز لو فرنجی کلیسارا
بزور بازوے من دست سلطنت ہمہ گیر(۸)

شارح اقبال یوسف سلیم چشتی اس نظم کی تمہید میں لکھتے ہیں

''اس نظم میں اقبال نے مزدور طبقہ کے جذبات کی ترجمانی جس خلوص کے ساتھ کی ہے اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے دل میں اس مظلوم طبقہ کی حمایت کا نہایت شدید جزبہ موجزن تھا۔ یک بڑے سے بڑا اشترا کی بھی اسے بڑھ کر مزدوروں کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک مزدور طبقہ کی حمایت اور مزدور کی عزت کا سوال ہے دین اسلام اشتراکیت سے بکلی ہم آہنگ ہے''۔

سرور دوعالم فرماتے ہیں۔ الکاسب حبیب اللہ یعنی مزدور اللہ کا دوست ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مزدور کو اسکی مزدوری اسکے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ اگر مسلمانان عالم۔ قرآن حکیم کی تعلیمات پر عامل ہوکر ملوکیت سرمایہ داری، اکتناز، احتکار، جاگیرداری اور زمینداری کو ختم کردے تو امید ہے کہ سارا روس مسلمان ہو جائیگا اور جب روس مسلمان ہو جائیگا تب امریکہ اور انگلستان کا مسلمان ہو جانا مشکل کی بات نہیں۔(۹)

ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظم سے علامہ اقبال مزدوروں میں یہ احساس پیدا کرنا پوری شدت سے کارفرما نظر آتا ہے کہ دنیا کی ساری رونق اور چمکدار چیز مزدوروں ہی کے دم سے قائم ہے۔ کارخانہ کی ہر چیز اور کاربار سبھی موٹا کپڑا پہننے والے اور فاقہ زادہ مزدوروں ہی کے بازو سے چلتا ہے۔ مالدار ہی ہمارے خون پی کے جیتے ہیں ہمارے پسینے کی کمائی سے مالدار کو ریشمی کپڑے اور زیور و جواہر نصیب ہوتے ہیں۔ ساری رونق

ہماری ہی بدولت ہے۔ اشتراکیت کے بارے میں علامہ اقبال کی لکھی ہوئی نظم ''حکومت الٰہی'' ملاحظہ کیجئے۔ یہاں علامہ اقبال نے بہت خوب صورتی سے سرمایہ دار اور محنت کش کی تصویر کشی کیں ہیں۔

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک

وہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک!(۱۰)

یعنی دنیا میں جتنے زمین ہیں اس کا مالک اللہ ہے۔ بادشاہیت اور حکومت کے آئین وقانون کا حاصل کیا ہے؟ اس سے گاؤ کے مالک موٹے تازے ہوتے ہیں اور کسان کمزور۔ اس نظم میں علامہ اقبال بڑی تفصیل کے ساتھ سرمایہ دار کے ہاتھوں میں مزدور کے استحصال کا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ مگر اقبال کو مزدور کی سادگی اور بے سمجھی کا بھی افسوس ہے وہ حیران و پریشان ہوکر کہتے ہیں مزدور جس کا سب کچھ ہے وہ سرمایہ داروں کی غلامی میں مبتلا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں

وائے نادانی! تو محتاج ساقی ہوگیا

مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو محفل بھی تو(۱۱)

علامہ اقبال مزدور کا حامی ہیں ان کے خیال میں مالک کو مزدور کی محنت کا پھل حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے اور شاید اشتراکیت کا ظاہری مقصد بھی یہی ہے۔ وہ دنیا کی سماجی اور معاشی انصافیوں اور نابرابری کے شدید مخالف تھے۔ ان کو اس بات کا احساس کثرت سے تھا کہ ایک بڑا طاقتور طبقہ ایک ضعیف اور معاشی اعتبار سے کمزور طبقے کا استحصال کر رہا ہے۔ وہ اس ظلم کو ختم کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کو جھنجھوڑا حتی کہ وہ اللہ سے شکوہ کیا۔ وہ یورپ کی ظالمانہ طاقتوں کے زوال کے متمنی تھے۔ اس لیے انہوں نے مارکسی اشتراکیت کی افادیت کا اعتراف مختلف لہجوں میں کیا۔ انہوں نے کارل مارکس کو مذہب سے بے تعلقی کے باوجود ''کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب'' کے نام سے یاد کیا۔ اقبال کہتے ہیں

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب(۱۲)

یعنی کارل مارکس موسی اور عیسی مسیح جیسے اچھے رہنما ہیں۔ وہ پیغمبر نہ ہونے کے بعد بھی صاحب کتاب

ہیں۔ یہی بات علامہ اقبال اپنی کتاب ''جاوید نامہ'' میں واضح الفاظ میں کہی اور کارل مارکس کا رشتہ ابراہیم خلیل اللہ سے جوڑا۔ ان کے خیال میں کارل مارکس کا انداز فکر تو کافرانہ تھا مگر قلب مومن جیسا تھا۔ اس کے باطل خیال بھی حق پر مبنی ہے وہ چاہتے ہیں کہ روٹی سب کو برابر ملے اس میں خرابی جو ہے وہ بس یہی ہے کہ اس کی فلسفۂ زندگی روحانیت اور ایمانیت خالی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق و باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است (۱۳)

''خواجہ مزدور'' کے عنوان سے اقبال نے جو نظم لکھی اس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے موجودہ زمانے کی بوتلوں میں وہ زہر دیکھا ہے جسے سانپ بھی چکھ لے تو تڑپ اٹھے گا لیکن اس کے باوجود آج وہ وقت آ گیا جبکہ کمزوروں میں شیروں کی طاقت پیدا ہوگئی آج یہ ممکن ہے کہ پانی کے بلبلے سے شعلہ باہر نکل آئے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک اپنے اندر زبردست انقلابی آہنگ رکھتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب !انقلاب! اے انقلاب (۱۴)

یعنی زمین دار اور مالک مزدوروں کے خون سے خالص لعل بناتا ہے اور زمین داروں کے ظلم سے کسانوں کی کھیتیاں برباد ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم انقلاب چاہتے ہیں۔ اگر ہم اقبال کے کلام کی روشنی میں جائزہ لیں تو ضرور اس نتیجہ پہ پہنچیں گے کہ اقبال نے انقلاب کے نغمے ضرور گائے ہیں۔ مارکس اور لینن کا ذکر بھی کیا ہے مگر ہر جگہ ان کا مخصوص انداز نظر قائم ہے۔ کیونکہ وہ اشتراکیت کے معاشی نظام میں روحانیت اور ایمانیت کی ضرورت ہے اس کے قائل تھے۔

اقبال کی نظم ''اشتراکیت، کارل مارکس کی آواز، لادین سیاست اور بلشویک روس وغیرہ ان کی اسلامی انقلابی

آزومندی کا اظہار ہیں۔یعنی اقبال کی تمنا تھی کہ روسی انقلاب ''اشتراکیت'' کے 'لا' کی منزل سے آگے بڑھ کر الا اللہ کے مقام تک پہنچ جائے۔یورپ کے اشتراکی انقلاب نے سرمایہ داری نظام کے سامنے ''لا'' کا نعرہ بلند کر دیا۔سرمایہ دارانہ خداوی سے انکار نے مسلمانوں کے سامنے سامراجی غلامی سے انکار کا راستہ روشن کر دیا۔آب صرف الا اللہ کی آواز بلند ہونا باقی ہے۔اقبال سرمایہ دارانہ استعمار کی شکست میں اشتراکی روس کے کردار کو اسلامی انقلاب کی دعوت قرار دی۔آب صرف مسلمانوں کو اپنے اعمال سے دوبارہ انسانیت کا نعرہ لگا کر اسلامی حکومت کے لیے کام کرنا باقی ہے۔یعنی اشتراکیت اگرچہ شر کی تمام چیزوں کو توڑ ڈالی مگر اس نے آب تک اللہ تعالی کا اعتراف نہیں کیا ہے۔اس لیے کہ وہ صرف ایک مادی طاقت ہے جس کو دوسری مادی طاقت توڑ سکتی ہے۔ اس لیے علامہ اقبال کے نزدیک نظام حکومت کی بنیاد مذہب اور اخلاق پر قائم ہونی چاہئے اور اس قسم کی حکومت صرف اور صرف اسلام ہی قائم کر سکتا ہے۔

## مأخذ و منبع

(۱) اقبال: خضر راہ، 'کلیات اقبال (اردو)، پبلیکیشنز غیر مذکور، دہلی، سن اشاعت، غیر مذکور، ص ۲۱۳۔ ۲۱۴

(۲) اقبال: ساقی نامہ، کلیات اقبال (اردو) پبلیکیشنز غیر مذکور، دہلی، سن اشاعت، غیر مذکور، ص ۳۴۴۔

(۳) ایضاً، ص ۳۴۵۔

(۴) ایضاً، ص ۳۴۴۔

(۵) ڈاکٹر جمیل احمد: اقبال اور سوشلیزم، ارمغان پبلیکیشنز، کراچی، پاکستان سن اشاعت ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۸۔

(۶) اقبال: دیباچہ پیام مشرق، پاکستان ٹائمز پریس لاہور۔ طبع اشاعت ۱۹۶۳، ص ج

(۷) اقبال: قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدو، پیام مشرق، پاکستان ٹائمز پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۶۳، ص ۲۵۵۔

(۸) اقبال: نوائے مزدور، پیام مشرق،، پاکستان ٹائمز پریس لاہو،، سن اشاعت ۱۹۶۳، ص ۲۵۷۔

(۹) یوسف سلیم چشتی، شرح پیام مشرق، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن اشاعت ۱۹۱۶، ص ۵۷۹۔

(۱۰) اقبال: حکومت الٰہی، جاوید نامہ، پاکستان، ٹائمز پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۵۹، ص ۷۹۔

(۱۱) اقبال: شمع اور شاعر، بانگ درا، پاکستان، ٹائمز پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۸۵، ص ۱۴۵۔

(۱۲) اقبال: ابلیس کی مجلس شوری، ارمغان حجاز، پاکستان ٹائمز پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۸۵، ص ۱۵۶۔

(۱۳) اقبال: اشتراک وملوکیت، جاوید نامہ، پاکستان ٹائمز پریس لاہور، سن اشاعت ۱۹۵۹، ص ۶۹۔

(۱۴) اقبال: حضور ملت، کلیات (فارسی)، شیخ علی پبلشرز لاہور، پاکستان، سن اشاعت: غیر مذکور، ص ۹۵۰۔

# ترکی کے اردو دوست خلیل طوقار کی شاعری کا فنی تجزیہ

حفصہ اختر ☆

اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کی سرپرستی میں جن حضرات کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ان میں ڈاکٹر خلیل طوقار کا نام اہم ہے۔ اردو ادبی دنیا میں یہ ہستی کئی حوالوں سے معروف و معزز ہیں۔ اردو ادب کے مختلف موضوعات سے انکی دلچسپی حیران کر دیتی ہے۔ وہ بیک وقت ایک ادیب، محتاط محقق، متوازن فکر رکھنے والے نقاد، ماہر تعلیم و مدرس ہیں۔ انہوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے اور خوب صورت جذبات کے شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے ترکی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ انکی مادری زبان اردو نہیں ہے، اسکے باوجود اردو شاعری میں انہوں نے جو خدمت انجام دی ہیں یہ قابل تعریف ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انکے لڑکپن میں انکے آس پاس بھی اردو بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ یونیورسٹی داخلہ لینے کے بعد ایک دوران لاہور سے پروفیسر غلام حسین ذوالفقار صاحب استنبول یونیورسٹی میں آئے تھے۔ وہ کلچرل ایکسچینج پروگرام کے سلسلے میں پاکستان سے تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد کے بعد یونیورسٹی میں اردو کی اختیاری کلاسز شروع ہوئیں۔ خلیل طوقار کچھ پروفیسر صاحب کی شفقت اور اپنے ذوق وشوق کی وجہ سے اردو کی طرف متوجہ ہونے لگے۔[1] ترک ہوتے ہوئے انہوں نے اردو زبان کی گرامر اور شاعری پر جو مہارت حاصل کی ہے اس کو لاجواب ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں ترک ہوں۔ اردو میری مادری زبان نہیں۔ نہ ہی میں ایک ایسے ماحول میں پیدا ہو کر پروان چڑھا جہاں اردو بولی جاتی ہو۔ میں نے بی اے کی تعلیم

☆اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ

کے دوران اردو سیکھنی شروع کی۔۔۔اس طرح میرے دل میں اردو سے محبت سی بیدار ہونے لگی اور یہ محبت زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ مجھے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ کچھ عرصہ بعد اردو سے محبت اور شعر و شاعری کے شوق کی آمیزش ہوئی اور غیر اختیاری طور پر میرے احساسات اردو کے روپ میں میرے قلم سے نکلنے لگے۔" ۲

ڈاکٹر خلیل طوقار ۳، اپریل ۱۹۶۷ء میں باقر کوئے استنبول میں پیدا ہوئے۔ جب وہ پانچ برس کے عمر کے تھے ان کا خاندان بحر سود کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے شہر ظونغولداق (Zonguldak) میں منتقل ہوگیا۔ پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم یہی مکمل ہوئی۔ والدین کے خواہش تھی کہ وہ انجینئر پڑھے لیکن انکا شوق زبان اور ادبیت کی طرف مائل تھا۔ ڈاکٹر خلیل طوقار نے ۱۹۸۹ء میں استنبول یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۹۲ء میں استنبول یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۱۹۹۵ء میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۹ء وہ تک اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر استنبول یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے منسلک رہے۔ ۱۹۹۹ء میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو استنبول یونیورسٹی میں منتقل ہوئے۔ ۲۰۰۶ء میں وہ پروفیسر ہوگئے اور نومبر ۲۰۰۹ء سے سینئر پروفیسر کے طور پر شعبہ اردو استنبول یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ ۳

یورپین اردو رائٹر سوسائٹی، لندن نے ۲۰۰۰ء میں انہیں "علامہ اقبال" ایوارڈ ۴ اور ۲۰۱۶ء میں کلکتہ کے صوفی جمیل اختر لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام "صوفی جمیل اختر میموریل ایوارڈ" سے سرفراز کیا گیا۔ ۵ اسکے علاوہ عالمی اردو مرکز، لاس انجلس اور دیگر قومی و بین الاقوامی اداروں کی جانب سے انہیں اعزاز سے نوازا جا چکا ہے۔ انکے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ہیں:

| شعری مجموعہ | ادارہ اشاعت | سن اشاعت |
|---|---|---|
| ایک قطرہ آنسو | قریشی آرٹ پریس | اگست ۲۰۰۳ء |
| آخری فریاد | رائٹرز ایسوسیشن لاہور | ۲۰۰۷ء |

خلیل طوقار کے پہلے شعری مجموعہ ''ایک قطرہ آنسو'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس مجموعہ کے ہر ایک نظم میں محبت، انسان، انسانیت کے بارے میں ان کی خیالات، لطیف جذبات و احساسات کا ایک خزانہ ملتا ہے۔ اس کتاب میں ان کی اردو کی بہترین (۷۲) آزاد نظمیں اور ایک فارسی پابند نظم ہے۔ اہل دانشوار ان کے نظموں کو نظم کی صنف میں شمار کرے یا نہ کرے اس بات کو لے کر انکو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ممکن ہے کہ بعضوں کے لیے اس مجموعہ میں موجود نظموں
کو نظم کی صنف میں شمار کرنا مشکل ہو، شاید میرا شمار بھی
شاعروں کی صف میں نہیں کیا جا سکتا۔ اور ویسے بھی اس
سلسلے میں یہ نہ میرا مدعا ہے، نہ میری ضد۔ یہ بھی ممکن ہے کہ
یہ نظمیں بعض اہل ہنر کے اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترتی ہوں۔
اِس لیے قارئین کرام سے میری گزارش ہے کہ اِس مجموعہ کا
مطالعہ کرتے ہوئے یہ مدنظر رکھیں کہ اِس میں موجود نظموں
کو کسی غیر زبان اجنبی نے قلم بند کیا ہے۔ جو بھی ہو، جیسے بھی
ہو، یہ نظمیں ان لمحوں کی یادیں ہیں جنہیں میں بھولنا نہیں
چاہتا۔'' [۶]

انہیں اردو زبان اور شاعری سے بیحد محبت ہے اور اس لئے انہوں نے اپنے ان کہی باتوں کو اظہار کرنے کے لئے اردو شاعری کو چنا۔ اردو زبان سے اپنی محبت کا اظہار وہ اپنی ایک نظم کے ذریعے کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''گرفتار ہیں ہم زبان ِ اردو کی محبت کے
ڈھونڈتے ہیں اسے اوراق پارینہ میں

---

پڑھتے ہیں ایک حسین غزل
جیسے لے جاتی ہے وہ دل کا غبار

---

اردو ہے یہ جس سے ہمیں محبت ہے
خود زندہ رہ کر محبان کو بھی جاوداں بناتی ہے!'' ۷

اس کتاب کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ نظمیں حمد و نعت کے انداز سے مختلف ہیں۔ مثلاً:

''اک نہ اک دن آؤں گا تیرے حضور
گناہوں کے بھاری بار

---

ڈر نہیں مجھے
عذاب الحریق سے
کیوں کہ مجھے بے شک ہے یقین
تو ہے رب میرا، تو ارحم الراحمین'' ۸

اور ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

''اے شفیع روز محشر اے نبی بے نظیر
عصر حاضر میں تری امت پریشان ہوگئی'' ۹

خلیل طوقار کی شاعری ترکی مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ اردو شاعری کا مزاج غزل سے زیادہ متاثر ہے جن میں اوزان کی ترتیب اور ردیف قافیے کے پابندی وغیرہ اجزاء لازمی ہے۔ لیکن ترکی شاعری نے بہت عرصے پہلے غزل کی راہ کو چھوڑ کر فرانسیسی اور انگریزی شاعری کے مزاج غیر پابند شاعری کو اپنالیا۔ ناظم

حکمت کی شاعری آزاد شاعری کی ایک علیٰ مثال ہے۔ناظم حکمت کی روایت ترکی شاعری میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی بدولت آزادی شاعری کو ترک میں مقبولیت حاصل ہوئی۔خلیل طوقار نے شاعری میں ناظم حکمت کی روش کو اپنایا ہے۔اس بارے میں پروفیسر ڈاکٹر اے بی اشراف کی یہ اقتباس قابل غور ہے:

> ''ناظم حکمت نے موضوع و معنی کے ساتھ ساتھ ہیئت اور فارم میں بھی زبردست تبدیلی پیدا کی۔اس نے ایک منفرد ردف اپنی شاعری میں پیدا کیا اور سطروں کو چھوٹا بڑا کیا، خوبصورت علامتیں، منفرد ایجری کا استعمال کیا۔خلیل طوقار کی شاعری بھی اُس انداز کی ہے۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ خلیل طوقار اپنے نظریات اور موضوع و معنی کے اعتبار سے ناظم حکمت سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن شاعری کے اسلوب کے لحاظ سے ان سے متاثر ہیں۔چنانچہ اپنی شاعری میں بھی انہوں نے یہی اسلوب اختیار کیا۔''[۱۰]

خلیل طوقار عام فہم لفظوں سے اپنے لطیف خیالات کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔انہوں نے شاعری کے ذریعے اپنے احساسات کو اس طرح بیان کیا ہے جسے پڑھکر قارئین بھی وہی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

''میں نے پوچھا شبنم سے
تیری عمر ہے کتنی
کہا اس نے مسکرا کر
کم سے کم تیری جتنی'' [۱۱]

ان کی شاعری ان کے جذبات کی صداقت، انداز فکر کی اثر پذیری اور اُن کے خلوص بیان سے متاثر ہے۔ جسکو تکنیک کے بجائے دل سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔وہ ایک آزاد خیالات اور فطری شاعر ہیں۔ انکی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوگا کہ وہ کسی مخصوص موضوع پر نظم لکھنے بیٹھے ہیں۔ان

کی نظمیں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نہایت سادہ اور صاف ہے اور ایسا لگتا ہے کہ قارئین کے مخاطب ہو کر بیان کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے، سنتے یا محسوس کرتے ہیں اسے قلم بند کر لیتے ہیں۔ انہوں نے عام اور معمولی موضوعات کو نہایت رنگین اور دلچسپی سے پیش کئے ہیں۔ انکے انداز بیان بے تکلفی ہے۔ وہ شاعری کے فطری تقاضوں کے تحت اپنے خیالات کے اظہار میں اشارے، کنایے، تشبیہات اور استعارات کا استعمال تو کرتے ہیں لیکن بہت کم، تا کہ شاعری کے پوشیدہ معنی کھو نہ جائے۔ مثلاً

"بھیگی تنہائیوں کی سنساں راتوں میں
چاند کے سامنے بیٹھتا رہا
بیٹھتا رہا، دیکھتا رہا، گھورتا رہا اسے
شاید کہ میرے چہرے کے نقوش
ابھر آئیں اس کے اوپر
تا کہ تم بھی دیکھتی رہو میری تصویر
جیسا کہ مجھے نظر آتی ہیں تم
چند کے سفید اور چمکدار
چہرے کے اوپر" [۱۲]

ان اشعار میں بے سخت گی سے انکی جذباتوں کا اظہار نظر آتا ہے۔ اور یہ فن انکی شاعری کو امتیازی شان عطا کیا ہے۔

انکے بعض ایسی کئی نظمیں ہیں جہاں وہ موجودہ زمانے میں انسانیت کے حالات کو بہت سادہ اور صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں انسان کے سامنے انسانیت شکست دے رہی ہیں۔ انسان کے عادات میں خودمختاری زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ جو عنقریب انسانی تمدن کی تباہی کی وجہ بن سکتی ہے۔ اس انسانی عادات کے بارے میں خلیل اپنی نظم میں کہتے ہیں:

''ہستی و نیستی کے خاک و غبار سے
اپنا دامن پاک کیا میں نے !

---

تخلیل کے شاہین ِ بلند پرواز کو
لوہے کے قفس میں بند کیا میں نے!
خزائن سے بھرا ایک شہر معمور
دانے کی قیمت میں بیچ دیا میں نے!
پہاڑوں کی سنسان چوٹی کے اوپر
اپنا آشیانہ بنایا میں نے !
انسانوں کی انسانیات دیکھنے کے بعد
اپنی انسانیت کو چھوڑ دیا میں نے!'' [۱۳]

خلیلؔ کے اس قسم کے طرز فکر اور بے ساختہ نظم ''ایک قطرہ آنسو'' میں کئی ہیں۔ بعض ایسی کئی نظمیں ہیں جن کو شاعر نے کوئی عنوان نہیں دیا ہے۔ جس سے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے صفحہ کی نظم اگلے صفحہ پر بھی جاری ہے۔ لیکن غور سے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کے حسن میں ایک نمایاں اضافہ اُن بے عنوان نظمیں ہیں۔ اس شاعری مجموعہ کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کی اکثر نظمیں بہت مختصر ہیں۔ خلیلؔ صاحب کو اپنی احساسات و خیالات کو سادگی اور صداقت سے چند سطروں میں بیان کر کے قاری تک پہنچانے کا مہارت حاصل ہے۔ اس بارے میں سرور عالم راز سرورؔ کا نظریہ یہ ہے:

''ان کی نظموں کی ایک خصوصیت اُن کے آخری مصرے ہیں، جہاں نظم کا بنیاد ی خیال چند خوبصورت سطروں میں مختلف پہلوؤں سے اُجاگر ہو کر اپنے فطری

انجام کو پہنچ جاتا ہے اور قاری کو اپنی بے ساختگی اور جذبات کی شدت بھری
ادائیگی کے اثر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے"۔[۱۴]

خلیلؔ صاحب چند سطروں میں اپنی جذبات کو قارئین کے سامنے ایسے کھول کر رکھ دیتے ہے کہ قارئین پڑھنے کے بعد دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی نظم کی داخلیت اور اس کے استعاروں کی استعمال اپنی مثال آپ ہیں۔ مثلاً:

"بھیگی تنہائیوں کی ہولناک رات میں
بجھی ہوئی امید کی بارش تلے
ایک بے کس بچہ چھت کے کنارے
لا پروائی کے عالم میں سو رہا ہے!
سنہری خوابوں کی دھوپ کے نیچے
کھوئے ہوئے مستقبل ڈھونڈ رہا ہے!
بھولی ہوئی خوشیوں کی یادوں سے
ہستی کا کھیل کھیل رہا ہے!" [۱۵]

اس نظم کو پڑھ کر مجھے ایک لمحے کے لئے میانمار سے جو روہنگا بچے پناہ کے لئے بنگلادیش میں آئے ہوئے ہیں انکے چہرے نظر آنے لگے۔ اس نظم میں خلیلؔ طوقار ہستی کے کھیل کے راز کو سادگی و بے سختگی سے پیش کیا ہے۔ خلیلؔ کی ایک نظم "نقاب اپنا" کی شانِ نزول میں انہوں نے یہ کہا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو انکے منہ پر ایک نقاب چڑھا ہوا تھا۔ دائی نے کچھ نہ سمجھ کر یہ نقاب کھینچنے لگی تو خلیلؔ صاحب کے دم گھٹتا رہا۔ آخر انکی نانی کی مدد سے یہ نقاب اتارا گیا۔ [۱۶] اس واقعہ کو انہوں نے ایک خاص مطلب کے ساتھ اپنی شاعری سے اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں نقاب چڑھکے اس لئے آیا تھا تا کہ دنیا کے بے رحمی کو نہ دیکھ سکے۔ اس نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

'' نقاب اڑھ کے آیا ہوں میں
جھوٹے رنگوں سے بھرے
اس گلشن بے وفا میں
نہ دیکھو تاکہ۔۔۔۔
سر سبز گھانسوں کا
بے رحم پاؤں تلے کچلنا''[۱۷]

خلیل طوقار کی شاعری انکی حق پسندی، انسان دوستی اور انکی حساس طبیعت کا عمدہ نمونہ ہے۔ وہ زندگی کی ناہمواروں، جنگ و جدال، مذہب وملت کی تفریق، دنیا میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں، انسان کی مجبوریوں اور محرومیوں سے بہت پریشان ہیں۔[۱۸] اور اسی پریشانی کی جھلک ان کی ''میں انسان ہوں''، ''کشمیر کے لئے''، ''ہوا کیا حاصل''، ''امید کا جنازہ'' وغیرہ نظمیں میں دیکھائی دیتی ہے۔ ان نظموں میں انسانیت کی شکست اور دنیا کے زوال کی شکایت ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے عصر حاضر میں انسان انسانیت سے ہاتھ دھوتے جارہا ہے۔ خلیل شاعری کے ذریعے قارئین سے مخاطب ہوکر انسانیت کی فریاد کرتے ہوے کہتے ہیں:

''اے اللہ پہ ایمان رکھنے والے
میرے مذہب سے بتا تجھے کیا ہے؟
جب بھائی کا خوں بہانا حرام ہے
مقتول بھی، قاتل بھی مرتکب گناہ ہے۔۔۔
مذہب سے گزر گیا، مانا کہ ہندوں ہوں
عیسائی ہوں، موسوی ہوں، گرو کا پجاری
جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، جس دین کا بھی حامی ہوں
پھر بھی میں انسان ہوں، کیا تجھے پتہ ہے؟''[۱۹]

ایک اور نظم میں شاعر کہتا ہے:

''رو رہا ہوں
قومِ نجیب کے غم میں
اس کے یتیموں کی خاموش فریادیں
پھاڑ رہی ہے کان
---
کسی مسیحائی نفس کی ضرورت ہے
سوچ رہا ہوں:
شاید اسرافیل کو صور پھونکنے کی ضرورت ہے!''[20]

خلیل طوقار کی شاعری سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مغربی قوموں کے حکمرانوں کی خبرداری اور ان کے تلوے چاٹنے والے تیسری دنیا کے حکمران کو نفرت کی نگاہوں میں دیکھتے ہیں۔ انکی نظم ''ملک کے کتے'' میں انہوں نے سرمایہ دار اور جاگیردار کے لئے 'کتا' لفظ کو استعارہ کے طور پر استعمال کر کے انکی ظلم اور خودغرضی کی اصلی تصویر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

اس شہر کے گلیوں میں
بھاگتے ہوئے کو نہ کو نہ ڈھونڈ رہے ہیں
کسی بے چارے غریب کا نیم مردہ جسم
تاکہ مرنے سے پہلے اس کو پکڑ لیں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا لیں
اس ذلیل مخلوق کو۔''[21]

آج کے زمانہ کو ترقی کے دور کہا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے دنیا ایک گھر جیسی ہوگئی ہے۔ مگر اس کے باوجود انسانیت ناپید ہے۔ دور حاضر میں بھی ظلم کی وہ مثالیں انسانوں نے پیش کی ہیں جو ایام جاہلیت کی یاد دیلاتی ہے۔ جسے دیکھکر شاعر بہت دکھی ہوتے ہیں اور تمام انسان کو ایک کنبہ تصور کرتے ہوئے مظلوموں کے درد کو اپنے الفاظ کے ذریعے ایسے بیان کرتے ہیں کہ ہمدردی کا پہلو خود بخود اجاگر ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

''ننھے منے ہاتھوں سے
اس نے خوابوں کا محل بنایا تھا۔۔۔
محبت نچھاور کرتے تھے جو
بے دریغ اور بے قیاس اس پر
انکی والدیں کی گم ہوئی لاشیں،
اب خاک وغبار تلے
ڈھونڈ رہی ہے بے چینی سے
کشمیری بچی'' ۲۲

اس نظم میں خلیل طوقار نے کشمیر کی حالت کی وجہ سے بچوں کے دکھ درد و آہ زاری کو صداقت سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور نظم مثال کے طور پر ملاحظہ ہے:

''زرافے کی گردن والو
اک ذرا ادھر تو دیکھو
ہم یہاں کچلے جا رہے ہیں
تمہارے پاؤں کے تلے
---

تم برساؤ آسمان سے
چاہے گولی چاہے میزائل
ہم ترس کر مر رہے ہیں
ایک ایک قطرہ آب کے لیے" ۲۳

خلیل طوقار دنیا کی مکاریوں سے بھی بہت پریشان ہوئے ہیں۔ اسے مکاری کے مختلف رنگوں کے بارے میں پتہ ہے۔ انہیں رنگوں کو وہ تمام افراد کو دیکھانا چاہتے ہیں تا کہ جوان سے ناواقف ہو، واقف ہو جائیں اور جو مالک ہیں انہیں آئینہ نظر آسکے۔

"جعلی سخاوت، جعلی تجارت، جعلی خطابت کرتے ہیں لوگ
دوستوں سے مکاری کر کے دوستِ حقیقی بنتے ہے لوگ
جعلی مشقت، جعلی ریاضت، جعلی عبادت کرتے ہیں لوگ
اپنی انا سے کر کے تغافل جعلی مسلمان بنتے ہیں لوگ" ۲۴

خلیل طوقار ایک خدا پرست اور انسان پرست انسان ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شدّت کے ساتھ اللہ سے کچھ مانگے تو وہ اپنے بندے کو کبھی بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ خلیلؔ کے پہلا اولاد پیدایش سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔ اس واقعہء کے بعد ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پھر کبھی بچہ نہیں پیدا ہوگا۔ لیکن انہیں اللہ پر بھروسہ تھا۔ اور چار سال بعد اللہ تعلیٰ کا فضل اور کرامت ہے کہ کسی طبعی مداخلت کے بغیر اللہ تعلیٰ نے انہیں ایک بچی سے نوازا۔ ۲۵ اس خوشی کو انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اظہار کیا ہے:

"دوست اقارب سے قرآن مصحف پڑھواؤں
تحفہ میری بیٹی آگئی" ۲۶

انسان اس دنیا میں ایک پردیسی ہے۔ اپنا وقت ختم ہونے کے بعد اسے یہ دنیا چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہی اصلیت اور حقیقت جانتے ہوئے بھی وہ لالچ، خواہشیں، خوابوں سے خود کو دور نہیں رکھ سکتا۔ آخیرت کے بارے میں

سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ شاعر اس بارے میں کہتا ہے:

''قیمت حباب جتنی ہے میری زندگی کی
پکتے ہوئے جذبوں کے بہاؤ کا نام ہے
ایک قطرہ جو بھرا ہوا فانی
ہوا سے خواہشوں اور تمناؤ کی'' ۲۷

اس طرح انہوں نے زندگی کی گیت کو پیش کیا ہے۔ خلیلؔ کی غزلوں کے مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اچانک سے کوئی ایسا شعر آجاتا ہے جو قارئین کو حیران کر دیتا ہے۔ صرف دو مصرعے اور چند لفظوں میں وہ اپنے سارے خیالات کو قارئین کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ مثلاً:

'' دل سے دل تک راہ کا جب رابطہ ہو جائے گا
شوق سے ملنے کا موسم خود بخود آجائے گا

''ان سے ملتے ہی مجھے یہ خوف ہوتا ہے خلیلؔ
چند لمحوں میں بچھڑنے کا سمے آجائے گا''

---

''میں امر ہونے کی دھن میں گم ہوا تھا اے خلیلؔ
حشر سے بھی بے خبر چل پھر رہا تھا میں کبھی'' ۲۸

اس طرح انکی شاعری میں انکے ہر ایک جذبات کا رنگ جھلکتا ہے؛ چاہے وہ محبت کا ہو یا پھر نفرت کا۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال نے خلیل طوقار کی شاعری کے بارے میں یہی رائے دی ہے:

''خلیل طوقار کی شاعری میں جہاں محبت بھری جذبات اور نرم و نازک خیالات کا احساس ملتا ہے وہاں انکی شعری لفظوں سے بغاوت کی بو بھی آتی ہے، ان کی شاعری میں انسانیت کا استحصال کرنے والی قوتوں کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود

نہیں ہے۔ انکی شاعری ایک نئے شعری اسلوب میں لکھی
ہوئی دستاویز ہے۔ انہوں نے اردو میں نظم کی طرح بغیر
قافیے کی غزلیں بھی لکھی ہیں''۲۹

ڈاکٹر ضیاء الحسن ''آخری فریاد'' کے دیباچہ میں خلیل طوقار کی شاعری کے بارے یہ کہا ہے:

''خلیل طوقار کی شاعری دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے تخلیقی عناصر کی ایک جائی سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ ان کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے جیسے لمحہء تخلیق میں بھی وہ دو زبانوں کی تہذیبی سرزمینوں سے بیک وقت نمو پذیری کی قوت حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے انکی شاعری میں مختلف فضا قائم ہوتی ہے۔ یہ فضا کسی مترجم کی بنائی فضا سے اس لئے مختلف ہے کہ جہاں اس میں ترجمہ نگاری کے عناصر کارفرما ہیں، وہیں ساتھ کے ساتھ تخلیق بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ خلیل طوقار ترک ذہن سے سوچتے ہوئے جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو یہ تخلیقی عمل ترجمہ نگاری سے سوا ہوا جاتا ہے اور ایک نئے تخلیق تجربے کی بازیافت بن جاتا ہے۔''۳۰

ڈاکٹر خلیل طوقار اتنی کم عمر میں اپنی محنت، لگن، مستقل مزاج سے اردو ادب اور شاعری کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایسا ایک ادیب و شاعر ہیں جس کی موجودگی ہی سے صرف ترک نہیں بلکہ پوری دنیا میں اردو زبان اور ادب کی وسعت اور فروغ کا عث ہے۔ اردو ادب و شاعری کو اتنی خدمت انجام دینے کے باوجود وہ ابھی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ منزل بہت دور ہے، ابھی بھی اپنے اپ کو کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ کہ اٹھتے ہیں:

''ہم کچھ بھی نہیں
ہمیں نہ پوچھ ہم
کچھ بھی نہیں

کچھ بھی نہیں

بس کچھ بھی نہیں''[۱۳]

خلیل طوقار کا شمار اب عصر حاضر کے اہم شاعروں میں کیا جا رہا ہے لیکن انہیں بہت جلد ایک ممتاز اردو شاعر کی حیثیت سے جانا جائے گا یہی امید کرتی ہوں۔

## مأخذ و منابع


۱۔حمیدہ شاہین، ''ترک غزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)''، سانجھ، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۔۲۵

۲۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، قریشی آرٹ پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص۔۱۷

۳۔حمیدہ شاہین، ''ترک غزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)'' ایضاً، ص۔۶۸

۴۔Academic bio data

۵۔''عالمی اردو ادب''، سہ ماہی، ۶ مارچ، ۲۰۱۶ء

۶۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ایضاً، ص۔۱۸، ۱۷

۷۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ''اردو ہے یہ'' ایضاً، ص۔۸۶

۸۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ''میں ہوں ثبوت''، ایضاً، ص۔۱۹

۹۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ''آؤں گا تیرے حضور''، ایضاً، ص۔۲۰

۱۰۔حمیدہ شاہین، ''ترک غزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)''، ایضاً، ص۔۵۷، ۵۶

۱۱۔ایضاً، ص۔۴۱

۱۲۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ''بھیگی تنہائیوں کی سنسان راتوں میں''، ایضاً، ص۔۹۸

۱۳۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ایضاً، ص۔۳۱

۱۴۔حمیدہ شاہین، ''ترک غمزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)''، ایضاً، ص۔۱۰۸

۱۵۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ایضاً، ص۔۹۸

۱۶۔ایضاً، ''نقاب اپنا''، ایضاً، ص۔۵۷

۱۷۔ایضاً۔ص۔۵۶، ۵۷

۱۸۔حمیدہ شاہین، ''ترک غمزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)''، ایضاً، ص۔۱۲۱

۱۹۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، ''میں انسان ہوں''، ایضاً، ص۔۳۲

۲۰۔ایضاً، ''کشمیر کے لئے''، ایضاً، ص۔۹۲

۲۱۔خلیل طوقار، ''آخری فریاد''، ''ملک کے لئے''، رائٹرز ایسوسیایشن، لاہور، ۲۰۰۷، ص۔۶۷

۲۲۔ایضاً، ''کشمیری بچی''، ص۔۷۰

۲۳۔ایضاً، ''افریقہ کی آواز''، ص۔۷۶

۲۴۔ایضاً، ''مشمولہ''، ص۔۲۹

۲۵۔خلیل طوقار، ''ایک قطرہ آنسو''، تیری پیدائش سے''، ایضاً، ص۔۵۴

۲۶۔ایضاً، ص۔۵۴

۲۷۔ایضاً، ''میری زندگی''، ص۔۸۵

۲۸۔حمیدہ شاہین، ''ترک غمزہ (ترکی میں اردو کا آہنی ستون، ڈاکٹر خلیل طوقار)''، ایضاً، ص۔۲۸

۲۹۔ایضاً، ص۔۷۷

۳۰۔ایضاً، ص۔۱۳۴

۳۱۔۔خلیل طوقار، ''آخری فریاد''، ، ایضاً، ص۔۵۱

# بنگلہ دیش میں فروغ اردو میں مدارس کا کردار :مسائل اور امکانات

ڈاکٹر رشید احمد☆

ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں فروغ اردو میں مدارس کا کردار محتاجِ بیان نہیں۔اس سلسلے میں بنگلہ دیش کے مدارس کا کردار خاص طور پر قابل داد بھی ہے۔یہاں کے عام باشندوں کی مادری زبان بنگلہ ہے اردو نہیں۔ بلکہ اردو ان کے لئے ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے باوجود اس خطے کے باشندوں نے عام طور پر اور اہلِ مدارس نے خاص طور پر شروع ہی سے جس طرح اس زبان کو اپنایا ،سراہا اور اس کی ترویج دینے کی کوشش کی،اسے دیکھ کر اس بارے میں غور وفکر کرنے والا کوئی بھی ذی شعور آدمی حیران و متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل یہ ایک فطری بات ہے،کیوں کہ زبان ایک فطری اور خداداد چیز ہے اس کی تخلیق کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہیں،قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:وہ ذات بڑی مہربان ہے ...جس نے انسان کو اظہارِ مافی الضمیر یعنی مافی الضمیر کو بیان کرنا سکھایا۔[1] اسی وجہ سے ہر زبان کے ساتھ انسان کا تعلق پیدائشی ہوتا ہے۔اگر وہ چاہے تو دنیا کی کسی بھی زبان وہ سیکھ سکتا ہے اور اس سلسلے میں اس کی فطرت اس کی حامی ہوتی ہے۔

درحقیقت اردو کے ساتھ اس علاقہ کے باشندوں کا جو تعلق اور لگاؤ ہے اس کی دو وجہ ہیں،ایک سیاسی یا بین المملکی ضرورت اور دوسری دینی ضرورت،جسے فطری ضرورت بھی کہا جا سکتا ہے۔پہلی وجہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۳۰ء میں حکمرانوں کے سامنے جب یہ بات آئی کہ ہندوستان کے باشندوں کو علومِ مغربی کی تعلیم دینے کے لئے ذریعہ تعلیم کون سی زبان کو قرار دیا جائے؟ اس وقت انہوں نے علومِ مغربی کو

☆ایسوسیٹ پروفیسر اور چیئرمین، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

انگریزی زبان ہی میں سکھانے کا فیصلہ کیا اور یہ انگریزی تعلیم ہی برٹش حکومت کا حقیقی مقصد ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کی جانب سے اپنے کارکنوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ اس میں جلد بازی نہ کی جائے۔

البتہ ابھی سے انگریزی تعلیم کی ہر طرح مدد کی جائے، جس سے مستقبل میں جب بھی انگریزی زبان کو یہاں کی دفتری زبان قرار دی جائے تو ایسے ملازموں کی کمی نہ ہو جو حکومت کی ذمہ داریاں اچھی طرح انجام دے سکیں۔ اور اس وقت حکومت نے بطورِ مصلحت مشرقی علوم کی ہمت افزائی کو بھی ضروری سمجھا اور عدالت کی تمام کاروائیاں وقتی طور پر دیسی زبان ہی میں رکھیں۔ غرض برٹش حکومت کی اسی پالیسی کے ماتحت انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو، فارسی اور بنگلہ زبانوں میں کیا جانے لگا اور بالواسطہ بنگال کے علاقوں میں اردو کی بنیاد پڑنے لگی۔ ۲ اور بالآخر ۱۸۳۷ء میں برٹش حکومت اور ان کے حامیوں کی کوششوں سے ہندوستان کی چھ سو سالہ مسلم حکومت کی تہذیبی اور تمدنی نشانی فارسی زبان کو ایک ایکٹ (جس کا نمبر ۲۹، مجریہ ۱۸۳۷ء ہے) کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں سے خارج کر دیا گیا اور اس کی جگہ علاقائی زبانوں کو دیدی گئی۔ چونکہ اردو کا رشتہ فارسی کے ساتھ مختلف وجوہ سے دوسری علاقائی زبانوں کے بالمقابل زیادہ مضبوط تھا، اس لئے اس ایکٹ کی سخت مخالفت کے باوجود یہاں کے باشندوں کی اکثریت (یعنی مسلمانوں) نے عدالتی زبان کے طور پر اردو ہی کو اپنایا اور یہاں اردو کی جڑ مضبوط ہوتی گئی۔ ۳ اس ایکٹ کی وجہ سے اگرچہ زبان فارسی کو نقصان پہنچا لیکن مسلم تہذیب و تمدن کے دشمن ان انگریزوں ہی کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ایک دوسری نشانی یعنی اردو زبان کو فائدہ پہنچ گیا۔ دوسری وجہ خطہ بنگلہ دیش میں اردو کی مقبولیت کی دینی بلفظ دیگر فطری ہے۔ کیونکہ دین اور مذہب کے ساتھ انسان کا تعلق دلی اور فطری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے دین کے سلسلے میں یعنی اس کو اپنانے اور قبول کرنے میں کسی طرح کی زبردستی اور دباؤ کو روا نہیں رکھا، ۴ کیونکہ اس معاملے میں دباؤ سے کام نہیں بنتا اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں دباؤ کے ذریعہ اردو کو ملکی زبان قرار دینے کی پالیسی کارآمد نہیں بنی۔ غرض فارسی کو عدالتوں

سے ختم کردینے کے بعد یہاں کے دینی حلقے یعنی اہل علم ودانش حضرات دینی علوم وفنون کو اس کی اصل یعنی عربی سے فارسی کے بجائے اردو میں منتقل کرنے لگے، اور چونکہ اپنے دین کے ساتھ انسان کا تعلق فطری اور ذوقی ہے اس لئے اس وقت یہاں کے مسلمانوں کے اندر اپنے دین کا ذریعہ ابلاغ اردو زبان سے بھی ان کا تعلق فطری اور ذوقی بن گیا۔ چنانچہ خطہ بنگلہ دیش میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کی ابتدائے آفرینش ہی سے وہ یہاں کے باشندوں کی اکثریت یعنی مسلمانوں کو بھانے لگی، اور مسلمانوں کی دینی اور روحانی قیادت چونکہ اہل مدارس کے ہاتھوں میں ہے اس لئے فروغ اردو میں یہاں زیادہ تر خدمات مدارس اور اہلِ مدارس ہی کے ہاتھوں انجام پائیں۔

خطہ بنگلہ دیش کے مدارس کی تاریخ بہت ہی پرانی ہے اور بڑی طویل بھی ہے۔ یہاں کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی سے یہاں مدارس کی بنیاد پڑنے لگی۔ ۱۲۰۱-۲ء میں محمد بن بختیار خلجی نے مغربی وشمالی بنگال کا ایک بہت بڑا علاقہ فتح کیا اور اپنا عارضی پایۂ تخت شہر ندیا کے عوض خطہ بنگلہ دیش کے شمال مغربی سرحدی علاقے میں رنگ پور نام کا ایک نیا شہر قائم کیا اور یہاں مسجد ،مدرسہ اور خانقاہ کی بنیادیں ڈالیں، اور وہی مدرسہ اس خطہ کا پہلا مدرسہ ہے۔ [۵] پھر ۱۲۷۰ء کے بعد سنارگاؤں (ڈھاکہ سے مشرقی جانب) میں ایک اور مدرسہ قائم ہوا، جس کے بانی علامہ شرف الدین ابو توامہ تھے۔ یہ سلاطینِ دہلی میں سے سلطان غیاث الدین بلبن کے دورِ حکومت ۶۴۲ھ-۶۸۵ھ بمطابق ۱۲۶۶-۱۲۸۷ء کا زمانہ تھا۔[۶] یہ مدرسہ اس وقت بنگال میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت میں بڑی خدمت انجام دی، اور یہی اس زمانہ میں برصغیر کا سب سے بڑا مدرسہ تھا۔ چنانچہ برصغیر میں سب سے پہلے شیخ ابوتوامہ ہی کے ہاتھوں (اسی سنارگاؤں میں) درس حدیث شریف کی بنیاد پڑی یعنی صحیحین کا درس شروع ہوا۔ اس کے بعد سترہویں صدی کے اخیر میں لکھنو میں فرنگی محل مدرسہ، اس کے بعد اٹھارھویں صدی کے نصفِ اخیر میں بردوان کا بوہار مدرسہ اور پھر انیسویں صدی کے نصفِ اخیر کے پہلے حصے میں یعنی ۱۸۶۶ء میں اتر بھارت کے ضلع سہارنپور میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم (سہارنپور) مدرسہ قائم

ہوئے اور اس کے تیس سال بعد (۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں) مشرقی بنگال کے چاٹگام میں دار العلوم دیوبند کی پیروی میں معین الاسلام ہاٹ ہزاری مدرسہ قائم ہوا۔ ۷

ظاہر ہے کہ تاریخ مدارس در خطۂ بنگلہ دیش کے ابتدائی زمانہ میں اردو زبان تو نہیں تھی، البتہ اس کا خمیر تیار ہونے لگا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں یہاں ذریعہ تعلیم یا تو عربی تھی یا فارسی۔ اور یہی حالت سلطنتِ مغلیہ کے تقریباً چھ سو سالہ دور حکومت (۱۳۰۰ء سے ۱۸۰۰ء) میں اسلامی درسگاہوں کی چلتی رہی۔ اس کے بعد آیا انگریزوں کی حکومت کا دور، ان کے دو سو سالہ حکومت کے زمانے میں تقریباً پہلی ایک صدی تک یہی حالت رہی۔ یعنی ذریعہ تعلیم فارسی یا عربی رہا۔ اور اس کے بعد یعنی انگریزی حکومت کی دوسری صدی کے شروع سے (یعنی ۱۸۳۷ء کے بعد سے) یہاں کے اسلامی درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو اپنی جگہ کرنے لگی اور بعد میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ جب یہاں کے دینی اداروں میں اردو نے فارسی کی جگہ لے لی اور مذہبی زبان عربی کے ساتھ اردو ہی بطور ذریعہ تعلیم رہ گئی اور فارسی برائے نام باقی رہی۔ اسی زمانے میں سید احمد شہیدؒ نے مولانا کرامت علی جونپوریؒ کو بنگال میں دعوتی کام کیلئے بھیجا، چنانچہ شہر رنگ پور کو مولانا نے اپنا قیامگاہ بنایا، یہاں مدرسہ اور خانقاہ قائم کیا، یہیں آج بھی مولانا کا مقبرہ مسلمانوں کا زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ اس خانقاہ اور مدرسہ میں مولانا کی وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت اردو ہی میں ہوتی تھی۔ ۸ چنانچہ اسی زمانہ سے اس خطے کے دینی سطح میں عام طور پر اردو استعمال ہونے لگا اور اسی کا سلسلہ یہاں کے مدرسوں اور دینی حلقوں میں آج تک جاری رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے مدارس کی اردو خدمات کے سلسلہ میں یہاں یہ واضح کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خطہ بنگلہ دیش میں ۱۹۴۷ء یعنی پاکستانی دور کی ابتدا سے آج تک دو طرح کے مدارس مروّج ہیں، ایک قومی مدارس اور دوسرے سرکاری مدارس یعنی جو مدارس مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ کے ماتحت اس کے نظام و نصاب کے مطابق چلتے ہیں۔ پہلے قسم کے مدارس کو مدارسِ درسِ نظامی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ بات تو اس میدان سے شغف رکھنے والا ہر ذی شعور کو معلوم ہے کہ درسِ نظامی بناء ملّا نظام الدین بن ملا قطب الدین

کے ہاتھوں عمل میں آئی، اور یہ ملا صاحب مضافاتِ لکھنو کا مشہور قصبہ سہالی کے باشندے تھے۔ ملا صاحب کی وفات ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ جبکہ ان کی ولادت ۱۰۸۹ھ مطابق ۱۶۷۸ء میں ہوئی۔۹ اسی نظام کے مطابق ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند۱۰ کی تعلیمی کاروائی شروع ہوئی اور خطہ بنگلہ دیش میں آج کی اردو خاص طور پر اسی دار العلوم دیوبند کی مرہونِ منّت ہے۔ کیونکہ وہی کا نظامِ تعلیم ضرورتِ زمانہ اور علاقہ کے پیشِ نظر کچھ ترمیم کے ساتھ آج تک بنگلہ دیش کے قومی مدرسوں میں جاری ہے۔ غرض درس نظامی کے مدارس یا قومی مدارس ہی آج تک یہاں اردو کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اگر وہ مدارس نہ ہوتے تو یہاں اردو بھی نہ رہتی۔ اب بھی ان مدارس میں تعلیمِ اردو کی جو حالت قائم ہے وہی اگر آئندہ قائم رہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہی اس خطّے کی اردو کے لئے حیاتِ جاودانی ثابت ہوگی۔

اور جیسا کہ اوپر گذر چکا کہ اس خطہ میں مدارس کا ایک دوسرا نظام بھی رائج ہے، جسے مدرسۂ عالیہ اور سرکاری مدرسہ سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بھی خاصی طویل ہے، البتہ اس کی حیثیت درس نظامی مدارس سے کم تر ہے۔ اس مدرسے کا بانی اور پہلا استاذ درسِ نظامی کے بانی ملا قطب الدین صاحب کے شاگرد تھے، جن کا نام ملا مجد الدین تھا۔ انہی کے ہاتھوں کلکتہ میں ایک کرایہ کے مکان میں، جو بیٹھک خانہ کے قریب (سیالدہ اِسٹیشن کے حدود میں) تھا، اکتوبر ۱۷۸۰ء مطابق شعبان ۱۱۹۴ھ میں اس مدرسے کا افتتاح ہوا اور ۱۷۹۰ء تک انہی کے زیرِ اہتمام درسِ نظامی کے نصاب کے مطابق چلتا رہا۔ شروع میں اس میں پڑھائی جانے والی ساری کتابیں درس نظامی کے مانند فارسی اور عربی میں تھیں۔ ان کے بعد سے یعنی سنہ ۹۲-۱۷۹۱ء سے مدرسۂ عالیہ کے دیکھ بھال کرنیوالے انگریز لوگ بنتے گئے، کبھی کمیٹی کی حیثیت سے، کبھی سکریٹری کی حیثیت سے اور کبھی پرنسپل کی حیثیت سے، اور یہ سلسلہ پہلی اپریل ۱۹۲۷ء تک جاری رہا، البتہ اس کے بعد سے مسلمان لوگ ہی پرنسپل ہوتے گئے، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کلکتہ عالیہ میں آخری انگریز پرنسپل کا نام مسٹر لیلکو نڈر ہاملٹن ہارلے اور اس میں پہلا

مسلمان پرنسپل کا نام شمس العلماء کمال الدین احمد ہے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے ڈھاکہ منتقل ہوتے وقت اس کا پرنسپل خان بہادر محمد ضیاء الحق تھے، چنانچہ منتقل ہونے کے بعد یہی صاحب مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ کا پہلا پرنسپل بنے [۱۱]، اور فی الحال مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ کا پرنسپل پروفیسر مولانا سراج الدین احمد صاحب ہیں۔ غرض یہ تھی مدرسۂ عالیہ کے سلسلہ میں مختصر تاریخی سرخی، رہی اس میں اردو تعلیم کی بات، تو وہ بھی نہایت ہی مختصر ہے۔ بقول پرنسپل پروفیسر مولانا سراج الدین احمد صاحب: آج کل مدرسۂ عالیہ سے اردو اٹھ چکی ہے صرف درجہ داخل اور عالم میں برائے نام اختیاری موضوع کے طور پر دو دو پرچے کر کے (ادب اور گرامر کے) دو دو سو نمبر کے امتحان ہوتے ہیں اور بس، درس و تدریس کچھ بھی نہیں۔ اور مدرسۂ عالیہ کی یہ حالت بنگلہ دیش بننے کے بعد سے بتدریج شروع ہوئی اور اب مکمل ہو چکی۔ شروع شروع میں البتہ کچھ دنوں تک درجہ فاضل اور درجہ کامل میں ذریعہ امتحان کے طور پر اردو قابل قبول تھی لیکن اب وہاں اردو اپنی موت مر چکی ہے، وہاں طلبہ ہی اسے موضوع یا ذریعہ امتحان کے طور پر نہیں لے رہے، گویا اردو کا رواج وہاں سے خود ہی اٹھ چکا۔ چند روز پہلے راقم الحروف نے اسی سلسلے میں پرنسپل مدرسۂ عالیہ پروفیسر مولانا سراج الدین احمد صاحب سے ملاقات کی، اس ملاقات میں ان سے فی الحال مدارس عالیہ میں اردو کی صورتحال کے سلسلے میں پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ آجکل یہاں کوئی اردو پڑھتا نہیں، بقول پرنسپل پروفیسر مولانا سراج الدین احمد صاحب یہ ہے آجکل مدارس عالیہ کی اردو کی حالت۔ خلاصہ یہ کہ انگریزی اور پاکستانی دور میں وہاں اردو لازمی موضوع کے طور پر تھی اور اس زمانے میں وہاں اردو کی حالت بہت اچھی تھی اور جب اسے اختیاری مضمون (اپشونل سبجکٹ) قرار دیا گیا تو اب کوئی اسے قبول نہیں کر رہا، کیونکہ اب اس میں دنیوی کوئی فائدہ انہیں نظر نہیں آ رہا۔ [۱۲]

رہا اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے قومی یا درس نظامی مدارس کے کارکنوں کا فی الحال موقف، سو وہ آج بھی باقاعدہ اردو زبان کی تعلیم دے رہے ہیں، ان مدارس کے اکثروں میں درجہ ابتدائیہ سے لیکر درجہ متوسطہ تک لازمی طور پر اردو سکھائی جاتی ہے، کبھی زبان کی حیثیت سے اور کبھی ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے۔ ان میں

کہیں کہیں تو "اردو خانہ " کے نام سے الگ شعبہ بھی قائم کیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بنگلہ دیش کا سب سے پرانا مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری کا نام سب سے آگے آتا ہے۔ یہ مدرسہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۶ء یعنی انیسویں صدی کی بالکل آخری دہائی میں قائم ہوا ہے، اس کے بانیین دار العلوم دیوبند کے فضلاء یا اس کے ساتھ کسی طرح منسلک تھے۔ چنانچہ شروع ہی سے اس میں ذریعہ تعلیم اردو رہی اور ایک سو بیس سال بعد آج بھی اس میں لازمی مضمون کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس مدرسے میں پڑھائی جانیوالی اردو کتابیں جماعت واری یہ ہیں:

* اردو جماعت (یعنی اردو خانہ) میں:- ۱۔اردو کا نیا قاعدہ، مصنفہ خان بہادر مولانا حسن صاحب ۲-اردو کا قاعدہ، مصنفہ مولانا انوار الحق قاسمی ۳- تعلیم الاسلام حصہ اول تا حصہ چہارم مصنفہ مفتی کفایہ اللہ صاحب دہلوی ۴-بہشتی گوہر، مصنفہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ۵۔ اردو کی پہلی، مصنفہ مولانا انوار الحق قاسمی۔

* فارسی خانہ میں:- ۶۔اردو کی دوسری اور اردو کی تیسری ۷۔نزہتہ القاری مصنفہ قاری محمد ابراہیمؒ ۸۔گلزار سنّت، مصنفہ مولانا محمد اصغر صاحب۔

* جماعت میزان یعنی عربی کی پہلی جماعت میں:-۹۔حکایات صحابہؓ مصنفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ۔

اسی جماعت میں کہیں کہیں علم الصرف مکمل نامی ایک کتاب، مصنفہ حضرت مولانا مشتاق احمد چرتھاوَلی دیوبندی، پڑھائی جاتی ہے یہ عربی صرف کی کتاب ہے لیکن اسکی زبان اردو ہے۔ یہ کتاب زیادتر ڈھاکہ کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح انہی مصنف کی ایک دوسری کتاب علم النحو جو اردو میں ہے، یہ کتاب بھی ڈھاکہ کے مدرسوں میں کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہے۔

* جماعت نحو میر یعنی عربی کی دوسری جماعت میں :-اردو کی تعلیم کے لئے باقاعدہ کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی (البتہ روضۃ الادب (مصنفہ مولانا مشتاق احمد چرتھاوَلیؒ) نامی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے جو اردو اور عربی زبان میں لکھی گئی ہے اور جس میں عربی کا ترجمہ اردو میں سکھایا جاتا ہے)۔

* جماعت ہدایۃ النحو یعنی عربی کی تیسری جماعت میں:- ۱۰۔تیسیر المنطق مصنفہ جناب مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحبؒ (گنگوہی)،اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ منطق کی کتاب ہے، البتہ یہ اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔

* جماعت کافیہ یعنی عربی کی چوتھی جماعت میں :-۱۱۔ تاریخ اسلام مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ۔اس مدرسہ میں باقاعدہ نصاب کی حیثیت سے اردو تعلیم کی یہی آخری کتاب ہے اور یہی آخری جماعت ہے۔

اس کے بعد والی جماعتوں میں یعنی جماعت دورۂ حدیث شریف تک اردو کی کوئی کتاب داخلِ نصاب اگرچہ نہیں ہے لیکن طلبہ مختلف کتابوں کی اردو شروحات اور تراجم سے ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اخیر میں قلت فرصت کی وجہ سے یہاں الگ الگ مدارس کے نام اور ان کے نصاب کی اردو کتابوں کے نام ذکر کرنے کے بجائے مدارس قومیہ کا سب سے بڑا بورڈ وفاق المدارس العربیہ بنگلہ کے نصاب میں شامل اردو کتابوں کی صرف ایک فہرست پیش کردینے پر اکتفا کیا جارہا ہے،جس سے اس کے ماتحت ہزاروں مدرسوں کا ذکر بھی ضمناً ہوجائے گا اور وہ یہ ہے:

المرحلۃ الثانویۃ العامۃ یعنی جماعت کافیہ میں :- تاریخ ملّت (خلافت بنی امیہ و بنی عباسیہ)؛ المرحلۃ المتوسطۃ یعنی جماعت ہدایۃ النحو:- میں تاریخ ملّت حصہ اول (خلافت راشدہ)، جمال القرآن،اور تیسیر المنطق یا المنطق؛ المرحلۃ المتوسطۃ ۲ یعنی جماعت نحومیر میں:- علم الصرف ۳۔۴،سیرت خاتم الانبیاء (۔مفتی محمد شفیعؒ)، مفتاح القواعد (اردو گرامر کی کتاب)؛ المرحلۃ المتوسطۃ ۱ یعنی جماعت میزان میں:-علم الصرف ۱۔۲، بہشتی گوہر،تاریخ الاسلام (۔محمد میاں صاحب)،غنیۃ القاری (علم قرائت کی کتاب)، کریما و پند نامہ مع اردو ترجمہ، اردو گرامر؛ المرحلۃ الابتدائیۃ یعنی تیسیر جماعت (پانچویں جماعت) میں:- تعلیم الاسلام حصہ چہارم،اردو کی تیسری، اور تیسیر المبتدی (،مفتی منصور الحق صاحب) یہ کتاب فارسی زبان کی تعلیم کے لئے ہے،لیکن یہ اردو میں لکھی گئی ہے۔۱۲ یہ ہیں

وفاق المدارس العربیہ بنگلہ دیش کے نصاب میں داخل اردو کتابیں۔اور پورے ملک کی اردو تعلیم کی قریب قریب یہی منظر ہے۔

پھر تخصص کی جماعتوں میں سے تخصص فی الفقہ الاسلامی کی جماعت میں اردو فتاویٰ کی کتابیں جیسے خلاصۃ الفتاویٰ، امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دار العلوم دیوبند وغیرہ، اور تخصص فی تفسیر القرآن الکریم کی جماعت میں اصول تفسیر کی ایک اردو کتاب علوم القرآن مصنفہ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی کہیں کہیں داخل نصاب ہے۔تاریخ الاسلام (۔اکبر نجیب آبادی) بھی تخصص میں کہیں کہیں داخل نصاب ہے۔

یہ ہے بنگلہ دیش میں اردو زبان کی مجموعی حالت، جس میں اسکے مسائل پر بھی روشنی پڑی اور امکانات بھی سامنے آئے۔اگر اہلِ زبان حضرات اس سلسلے میں ہمیں اپنی قیمتی ہدایات اور مشوروں سے نوازیں تو انشاءاللہ ہمارے لئے سرزمین بنگلہ دیش میں اردو کی ترقی کی منزلیں طے کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔

## حوالہ جات


۱۔قرآن مجید، سورۂ الرحمن، آیت نمبر ۱۔۴

۲۔مولانا عبدالستار، تاریخ مدرسۂ عالیہ ۱۷۸۱ء تا ۱۹۵۹ء، سالِ طباعت: ۱۹۵۹ء، ینگ پریس، ۷ رکیلاش گھوش لین، ڈھاکہ، ج ۱، ص ۹۸۔۱۱۰

۳۔مولانا عبدالستار، تاریخ مدرسۂ عالیہ ۱۷۸۱ء تا ۱۹۵۹ء، ج ۱، ص ۱۰۵

۴۔قرآن مجید، سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۵ : البتہ کوئی اگر اس کو دل سے اور اپنی خوشی سے اپنالے گا تو اسلام اس پر اپنے احکامات اور قوانین جاری کرے گا، اور یہ اس کا حق ہے کہ اس کے اندر اپنی مرضی سے داخل ہونے والے کو وہ اپنے خاص سانچے پر ڈھالے۔

۵۔مولانا عبدالستار، تاریخ مدرسۂ عالیہ، ج ا ، ص ۲۲

۶۔محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ: عبدالحی خواجہ ایم، اے، مکتبہ ملت دیوبند یو پی، ۱۹۸۳ء ج ا، ص ۲۷۷۔۳۰۰

۷۔ڈاکٹر محمد عبدالباری، بنگلہ دیشے عربی، فارسی و اردو تے اسلامی ساہتیہ چرچا، اسلامک فاؤنڈیشن بنگلہ دیش، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵

۸۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت حصہ ششم (جلد دوم) مجلس نشریات اسلام، کراچی، (بلا تاریخ) ص ۵۲۲

۹۔مولانا عبدالستار، تاریخ مدرسۂ عالیہ، ج ا، ص ۴۷۔۴۸؛
The Muslim and Christian Calendars (from the Hijra to the year A.D.2000), by G. S. P. Freeman/ Grenville, London: Oxford Univerrsity Press,New York Toronto, 1963,p -55 .

۱۰۔بنائے دارالعلوم کی کچھ تفصیل ایسی ہے: دارالعلوم دیوبند کے قیام کا عمل بلفظ دیگر اس کی تحریک ذیقعدہ ۱۲۸۲ھ بمطابق ۱۸۶۶ء ۹ میں شروع ہوئی اور ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰/مئی ۱۸۶۶ء) بروز جمعہ برات دارالعلوم دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔سیّد محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند (یو، پی)، طبع اوّل، ۱۹۹۲ء، جلد اوّل، ص ۱۳۵

۱۱۔مولانا عبدالستار، تاریخ مدرسۂ عالیہ، سابق، ج ا، ص ۳۵۔۵۳؛ ج ۲، ص ۱۵۵ و ۱۵۶

۱۲۔مقادیر اسباق، وفاق المدارس العربیہ بنگلہ دیش ۱۴۳۲ھ ص ۱۲۔۱۶

# اردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا حصہ

ڈاکٹر رضاء الکریم ☆

اردو زبان دنیا کی جدید ترین زبانوں میں ایک اہم ترین زبان ہے۔ اردو اس زمانے کی یادگار ہے جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئی اس وقت اہل ہند سے ان کا میل جول روز بروز بڑھتا رہتا تھا۔(۱) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئی اس وقت ان کی زبان فارسی تھی اور بہت دن تک دربار اور دفاتیر میں فارسی جاری تھا۔ اس وقت ہندوں نے بھی بڑے شوق و ذوق سے فارسی سکھتے تھے۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی علمی اور مذہبی زبان تھی۔ ادھر ہندوستان میں جو زبان ( قدیم ہندی یا پراکرت ) رائج تھی اسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ نتیجے میں ہندوستانی عوام میں ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی۔ جسے ہم اردو کہتے ہیں۔(۲) اردو کا معنی لشکر گاہ کے ہیں اور بادشاہی فوج کو اردوئے معلیٰ کہتے تھے۔ شروع میں اردو زبان کا نام اردو معلیٰ تھا۔(۳) یہ نام شاہ جہان کے عہد میں دیا گیا تھا۔ بعد میں صرف اردو رہ گئے۔

اردو نثر کی فروغ دینے میں فورٹ ولیم کالج نے ایک زبردست حصہ ادا کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج گورنر جنرل ولیزلی کی ایما پر پروفیسر ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں قائم کیا تھا۔ اگرچہ اس کالج کے قیام کا مقصد خالص سیاسی تھا مگر اس کے ذریعہ اردو نثر میں ایک نئی جان آ گئی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے پہلے پروفیسر تھے۔ اور اردو زبان کے بڑے حامی و خیر خواہ تھے۔

---

☆ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ

ایسٹ انڈیا کمپانی کے انگریز افسروں کو ہندوستانی زبان سکھانے کی غرض سے یہ کالج قائم کیا گیا تھا۔ جان گلکرسٹ پہلے انگریز ہیں جنھوں نے اردو زبان کے قوائد پر ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ انہوں نے ملک کے اطراف و اکناف سے اردو ادیبوں کو فورٹ ولیم میں ملازمت کا بندوبست کرایا تھا۔ اور ان کے ذریعے تصنیف اور تالیف کا کام انجام دلایا تھا۔ فورٹ ولیم کالج قیام ہونے سے پہلے اردو زبان صرف بول چال کی زبان تھی۔ نثر میں کوئی ادبی ذخیرہ نہ تھا۔ (۴)

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو نثر میں ادبی ذخیرہ جمع ہوا۔ رفتہ رفتہ اردو نثر ایک ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں میں اگر چہ طبع زاد تصانیف کم ہے مگر زبان و بیان و تہذیب کی تصویر ضرور ملتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں تین قسم کے معلم تھے۔ جیسے پنڈت، پروفیسر اور منشی۔ انگریز معلموں کو پروفیسر۔ ہندو معلم کو پنڈت۔ اور مسلمان معلم کو منشی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج میں اردو کے علاوہ بنگلہ اور ہندی میں تصنیف و تالیف ہوتی تھی۔ اس مضمون میں شعبۂ ہندوستانی سے تعلق رکھنے والے یعنی اردو مصنفین کے مختصر حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جس ادیبوں نے ملازمت اختیار کی ان میں سے اکثر تباہ حال لوگ تھے۔ کچھ شاعر، اور کچھ تذکرہ نگار تھے۔ ان ملازموں کو کالج کی زبان میں منشی کہا جاتا تھا۔ منشیوں میں میر منشی، سیکنڈ منشی ہوتے تھے۔ یہ منشی تصنیف و تالیف اور ترجمہ و تصحیح کے علاوہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان منشیوں میں میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، میر بخش علی، میر امن، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، سید مصور علی، خلیل خان اشک، میر معین الدین، فیض وغیرہ کے نام نہایت قابل ذکر ہیں۔،

## میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے ملازموں میں اہم تھے۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ تھا۔ وہ دہلی کے باشندے تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تقرر چوتھائی ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔ وہ کالج کے

پہلے منشی تھے۔ وہ تصنیف کے علاوہ مترجم کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ انکی مشہور تصنیفات میں اخلاق ہندی ۱۸۰۱ء، نثر بے نظیر ۱۸۰۲ع اور تاریخ آشام ۱۸۰۵ء ہیں۔ نقلیات نعمانی اور ترجمہ قرآن بھی قابل ذکر ترجمہ ہیں۔

نثر بے نظیر میر بہادر علی حسینی کی ایک اہم کتاب ہے۔ اصل میں یہ کتاب میر حسن دہلوی کی مثنوی سحر البیان ۱۷۸۴ء کا نثری پیکر ہے جسکو حسینی نے گل کرائسٹ کے فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں نثر میں منتقل کیا تھا۔ یہاں دو طرح کے اسالیب اور مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ کالج کے طلباء کو آسانی سے اردو سیکھنے کے لئے سیدھا سادہ ہندی الفاظ استعمال کیا ہے۔ دوسرے مقصد یہ ہے کہ اس میں خواص کے محاوروں اور عربی، فارسی کے الفاظ وغیرہ کا اہتمام کیا گیا۔ بقول بہادر علی حسینی:

ایک کو عام کی بولی میں جس دھپ سے سب کوئی آپس میں بولتے ہیں، سو مبتدیوں میں ہندوستانی زبان سیکھنے کے واسطے بہت اچھی ہے۔ کیونکہ اس میں ہندی کے بتہ سے الفاظ میں اور دوسری خاص محاوروں میں کہ جس وضع سے اشخاص امتیازی باہم گفتگوں لاتے ہیں وہ منشیوں کے مطالعہ کے واسطے نہایت خوب ہے۔ کس واسطے کہ اس میں الفاظ عربی اور فارسی کے زیادہ مخلوط ہیں۔ ۵

یہ کتاب مکمل طور پر ۱۸۰۳ع میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ اس کی قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس میں شہزادہ بے نظیر اور بدر منیر واردات عشق کا ذکر ہے۔ یہاں واقعات اور حالات کی خوشگوار، دلچسپ اور پر کیف فضا نہیں ملتا ہے۔ بلکہ یہاں سادہ اور سلیس انداز بیاب کے بجائے مقفی و مسجع انداز استعمال کیا گیا ہے۔

بہادر علی حسینی کی دوسرے اہم کتاب اخلاق ہندی مفتی تاج الدین بن معین الدین کی سلیس فارسی کتاب مفرح القلوب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ملکی نے سنسکرت میں ہتو پدش سے فارسی میں مفرح القلوب کے نام سے ترجمہ کیا۔ بعد میں میر بہادر علی حسینی نے س کتاب کو اردو میں ۱۸۰۱ء میں ترجمہ کیا اور اخلاق ہندی نام دیا۔ اخلاق ہندی کا موضوع اخلاقیات ہے۔ ان کے قصے اور حکایتوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی درس ضرور ملتا ہے۔ جیسے خود حسینی کہتے ہیں: ایسے عجیب وغریب قصے لپٹے ہوئے ہیں جنکے

دیکھنے اور سننے سے آدمی دنیا کے کاروبار میں بہت ہوشیار، نہایت چالاک ہو جاوے علاوہ اسکے بھلی بری حرکتیں ہر ایک نظر آویں۔٦

اخلاق ہندی چار ابواب میں مشتمل ہیں۔اس کتاب کے پہلے باب میں اپنے دوستوں کا ذکر کیا کیا ہے۔دوسرے باب میں دوستوں کی جدائی کے حالت میں بیان کیا ہے، تیسرے باب میں اپنے جیت اور مخالفت کی شکست کی کہانی اور چوتھے باب لڑائی کے آگے یا پیچھے میں ملنے کی کیفیت کا ذکر ہے۔

تاریخ آشام بہادر علی حسینی کا ایک اہم کتاب ہے۔ یہ ولی احمد شہاب الدین کی طالش فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے جو ۱۸۰۵ء میں حسینی نے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۳۹ اوراق پر مشتمل ہیں اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔اس کتاب میں دو مقالے ہیں پہلے مقالے میں نواب میر سعید کو دج بہار کے لئے روانگی اور راجہ بیم نرائن کی بیخ کنی اور فتح کی روداد بیان کی گئی ہے۔ یہاں کو دج بہار کے علاقے کی پورے جغرافیائی خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ وہاں کی اب و ہوا، پھولوں اور پیڑ پودوں وغیرہ کے حال اور طرز معاشرت، قومی رسم و رواج اور رہن سہن کا بیان موجود ہیں۔دوسرے مقالے میں آشام کی فتح کے لئے لشکر کے کوچ کرنے اور رانا بادشاہ کی مدد سے فتح حاصل کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ آشام کی جغرافیائی خصوصیات اور دیگر معلومات بھی درج کی گئی ہے۔اس کے علاوہ آشام کی اب و ہوا، دریاؤں کی تعریف، پھولوں پھلوں اور باغات کا بیان کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں وہاں کی دیگر خوبیاں، خامیاں، رہن سہن، رسم و رواج، سماجی حالات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔حسینی نے تاریخ آشام میں عموماً محاورہ اور رواں زبان اور مقامی الفاظ استعمال کی ہے۔اس کتاب میں اردو کے علاوہ ہندی اور عربی الفاظ اور جملے کثرت سے استعمال کیا ہے۔

### میر شیر علی افسوس

افسوس کے والد کے نام سید علی مظفر جان تھا۔ان کا آبائی وطن افغانستان تھا۔محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں ان کے اباء و اجداد دہلی آئے اور دہلی ہی میں افسوس ۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے۔افسوس لکھنو کے دربار سے

تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں وہ کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی میں مترجم کی عہدے پر فائض ہوئے۔ افسوس نے شیخ سعدی کی مشہور کتاب گلستانِ سعدی کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا تھا۔ ترجمہ کے علاوہ بہار دانش، مذہب عشق لکھے تھے۔ تصنیف اور تالیف کے علاوہ وہ شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔

شیر علی افسوس نے پہلے گل کرسٹ کے ایما پر ۱۸۰۱ع میں شیخ شعدی کی فارسی کتاب گلستاں سعدی کا اردو ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا تھا۔ یہ ان کا مقبول و معروف اور شاہکار ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں ترجمہ کے متعلق افسوس کہتے ہیں۔

صاحب موصوف گل کرسٹ نے مہربانی سے فرمایا کہ تو گلستانِ سعدی کا زبان اردو میں ترجمہ کرے۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی یہ ظاہر صاف اور یہ باطن پیچیدہ وار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت اخلاق بے شمار۔ ۸

یہ کتاب ہندوستانی پریس سے دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ باغ اردو کے اقتباسات میں گل کرسٹ کی ہندی مینول شامل ہیں۔ یہ کتاب میں افسوس نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ویلیزلی کی مدح و تعریف کی ہے۔ جلد اول میں ایک اشتہار، احوال، فارسی رسم الخط، مترجم کا دیباچہ، شیخ سعدی کا دیباچہ، اس کے بعد تین باب میں گلستان کے ترجمے کئے ہیں۔ اس کی دوسری جلد چوتھے باب سے شروع ہوتی ہے یہ ابواب میں مختلف انواع کے موضوعات محیط ہیں۔ اس کتاب میں مختلف سبق اور نصیحتیں شامل ہیں۔ حکایات کے ترجمے کے علاوہ ابیات کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ باغ اردو کی زبان بے کیف اور بے جان ہے۔ اس کے اسلوب سادہ اور آسان اور عام فہم ہونے کے باوجود سادگی اور سلاست کے آہنگ اور ترنم عاری ہے۔ عبارتوں اور جملوں سے ترجمہ پن صاف صاف نمایاں ہے۔

میر شیر علی افسوس کا اور ایک مشہور یادگار کتاب کا نام آرائش محفل ہے۔ یہ کتاب مسٹر ہارنگٹن اور کالج کونسل کے فرمائش پر لکھی ہوئی یہ ہندوستان کے معتبر و مستند فارسی کتاب اخلاق التواریخ کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب منشی سجان رائے کی تاریخ ہے۔ اس کتاب میں ہندوستانی خصوص ذکر کرنے کے علاوہ

اٹھارہ صدیوں کے احوال اور سلاطینِ ہنود اور مسلمانوں کے تذکرے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمان بادشاہوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔ یہ جغرافیائی خصوصیات، پھلوں، پھولوں، جانوروں، علم و کمال، رسم و رواج اور فقروں کا بھی ذکر موجود ہے۔۹

انہوں نے آرائش محلف میں مختلف احوال کے ذیل جابجا اپنی ذات سے متعلق جو واقعات درج کیے ہیں یہ واقعات صرف دلچسپ ہی نہیں ہے بلکہ ان کے سوانح الحیات مرتب کرنے میں بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

آرائش محفل کی زبان و بیان بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس میں افسوس نے تاریخی حالات کو بے حد دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہاں ایک نئی انداز نگارشات متعارف ہوتے ہیں۔ آرائش محفل کی زبان سادہ اور آسان ہے۔ اس میں روزمرہ کے الفاظ کے بجائے عربی، فارسی کا الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ہندی الفاظ کے بیان موجود ہے۔۱۰

میر امن: اردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے جتنے نثر نگار اہم رول ادا کیا ان میں میر امن سب سے زیادہ شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے۔ ان کا اصل نام میر امان ہے۔ میر من کا تخلص لطف تھا۔ ان کا مولد وطن دہلی تھا۔ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج ملازمت حاصل کی۔ اور اس کالج ہی میں ملازمت کے دوران ان کی سب سے زیادہ اہم کتاب ۱۸۰۲ء میں باغ و بہار تالیف کیں۔ باغ و بہار فارسی چہار درویش کا آسان اردو ترجمہ ہے۔ قصہ چہار درویش اپنے عہد کا مقبول ترین قصہ تھا۔ فارسی میں اس کا متعدد نسخوں کا ذکر ملتا ہے۔ اردو میں چہار درویش میں تین نسخے ملے۔ ایک کی کتاب نوطرز مرصع ۱۸۷۵ء، دوسرا میر امن کی باغ و بہار ۱۸۰۲ء اور محمد غوث زرین کا چہار درویش ۱۸۰۲ء ہے۔ باغ و بہار کا ماخذ نوطرز مرصع ہے ان باغ و بہار کے سارے واقعات نوطرز مرصع سے مماثلت نہیں تھے۔ بعض جگہ باغ و بہار نوطرز مرصع سے اختلاف ہے۔۱۱

باغ و بہار اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک داستان ہے۔ میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین تحسین نے اس قصہ کو اردو میں ترجمہ کر کے نوطرز مرصع نام رکھا تھا۔ ترجمہ کرنے کے وقت میر امن نے تحسین

کے نسخے کو پیش نظر رکھا ہے۔ باغ و بہار اس داستان انداز بھی نمایاں ہے۔ یہ مافوق الفطرت پر زور نہیں دیا گیا تاہم ان کی ہلکی سی جھلک مل جاتی ہے۔ عام داستانوں کی طرح باغ و بہار کے پلاٹ میں وحدت مفقود ہے۔ اس میں چار درویشوں کا قصہ موجود ہے۔ اس داستان کے کردار اتنے بھرپور ہے کہ میر امن نے گویا زندہ تصویر پیش کی ہیں۔ وہ کردار نگاری میں جزئیات اور واقعات کو بیان کرتے ہیں کہ بڑی واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ باغ و بہار میں ہندوستان کی جغرافیائی حالت بھی موجود ہے۔ ہندوستان کے علاوہ فارس کرگستان، بصرہ، چین اور روم وغیرہ ملکوں کی جغرافیائی حالت بیان کیں۔۱۲

باغ و بہار کا سب سے بڑا حسن اسکی زبان و بیان ہے۔ میر امن باغ و بہار میں جو زبان استعمال کی اس پر اس عہد میں شدید نکتہ چینیاں کی گئیں۔ میر امن نے اس پاس کے ماحول کی تصویریں دیانت داری سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ انہوں نے مروجہ مہمل الفاظ اور عوامی کہاوتوں کا کھل کر استعمال کیا ہے۔ یہاں بول چال کی زبان اپنے نقطۂ عروج کو پہنچے گئی ہے۔ انکے اسلوب میں بڑی متوازن روانی ہے۔ وہ ہر مقام، ہر کردار اور ہر ماحول کا بیان ایک ماہرداں کی طرح کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے اسلوب کے سہارے آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے سراپا نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری بہت ہی سادہ انداز میں کی ہے۔ یہاں میر امن نے دہلوی معاشرت کی بڑی زندہ تصویر پیش کی ہیں۔ دہلوی معاشرت کی مرقع کو میر امن نے مالا مال کر دیا ہے۔ میر امن کی زبان کی سادگی اور سہل ممتنع کسی خاص مقام یا کسی خاص سیر میں جلوہ گر نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے۔

باغ بہار اس زمانے کے ہندوستان خاص کر کے دہلی کی معاشرف وہاں کے لوگوں کے بیاہ، حیات و موت وغیرہ کے رسم و رواج اور عوام کے معتقدات وغیرہ کا ایک مرقع ہے اور سماجی زندگی کے ہر گوشے کا بیان ہے۔۱۳

گنج خوبی میر امن کے اہم اور غیر معروف دوسرا کارنامہ ہے۔ یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف اخلاق محسینی کا اردو ترجمہ ہے۔ اخلاق محسینی تاریخی نام ہے۔ گنج خوبی میں صابطۂ حیات اور موز اخلاق، سیرت اور عمل کے نکات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں حیات انسانی کے تقریبا تمام اخلاقی پہلوؤں کا

احاطہ کیا گیا ہے۔اس میں بہت سی حکایتیں اور نقلیں درج ہیں۔ یہ کتاب کے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ مضامین کا مفہوم اخذ کر کے اسے اردوئے معلّٰی کی زبان ومحاورہ میں بیان کیا ہے۔انہوں نے گنج خوبی کے دیباچے میں اسکی زبان وبیان پر پوری روشنی ڈالئے۔

یہ زبان کچھ کیفیت نہ پاتی بلکہ امیزش کر کچھ زبان اور کی ہو جاتی اب یہ مبتدی کے واسطے فائدہ مند اور منشی صاحب کو دریافت پسند کی ہوگی۔ کیا بے لگاؤ ویاد کی مانند اسکی عبارت اور مثال گھوڑے یاد پا کی کے میدان ہموار اور صاف پا تارواں ہے۔[۱۴]

### سید حیدر بخش حیدری

ان کا اصل نام حیدر بخش ہے اور حیدری ان کا تخلص ہے۔وہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ان کی کتاب کی تعداد بہت ہیں۔انکے والد کا نام ابوالحسن ہے۔ حیدری کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔فورٹ ولیم کالج کے لئے گل کرئسٹ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اعلی درجے کے اہل قلم اور اردو انشاپردازوں کو کلکتہ میں جمع کئے ہیں۔اس سلسلے میں حیدری نے بھی سفر کے طور پر ایک کتاب قصہ مہر ماہ کے نام سے مرتب کی۔اس کتاب گل کرئسٹ کو بہت پسند آیا۔اس لئے حیدری کو منشیانِ کالج کے زمرہ میں ملازم رکھ لیا۔

گل کرئسٹ کی فرمائش پر حیدری نے مثنوی لیلی مجوں ۱۸۰۱ء کو اردو میں منتقل کیا۔اس کے بعد طوطا کہانی ۱۸۰۱ء ،آرائش محفل ۱۸۰۱ء ،گلدستہ ۱۸۰۱ء ،جامع القوانین ۱۸۰۳ء ،گلزار دانش ۱۸۰۴ء ہفت پیکر ۱۸۰۹ء ،تاریخ نادری ۱۸۰۹ء اور گل مغفرت ۱۸۱۲ء وغیرہ کے نام سے بہت قیمتی اور نادر کتابیں تصنیف کیں،ان کا انتقال ۱۸۳۳ء میں ہوا۔ ۱۵

حیدری کی پہلی کتاب قصہ مہر وماہ ہے۔حیدری نے انکی مشہور کتاب قصہ لیلی مجنوں ۱۸۰۱ء میں اردو نثری زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔مگر حیدری کی شہرت کا دار ومدار انکی دو کتاب یعنی طوطا کہانی اور آرائش محفل پر ہے۔طوطا کہانی اس لئے نام رکھا گیا کہ اس کتاب کی

تمام کہانیاں طوطا کی زبانی میں بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب میں ۳۵ (پینتیس) کہانیاں ہیں۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کے عدم موجودگی کی حالت میں اپنے محبوب سے ملنے چاہتی ہیں۔ طوطا ہر روز اسکو ایک کہانی سناتا ہے اور صبح کر دیتا ہے۔ اس لئے اس عورت اپنے محبوب کی ملاقت کے لئے نہیں جا سکتی اس دوران شوہر آجاتا ہے۔ اور اسی طرح کہانی چلتی رہتی ہے۔طوطا کہانی کی زبان بہت سادہ اور سلیس ہے۔اس میں نہ شعبدہ ہے اور نہ الفاظ کی گڑی۔حیدری نے اس کتاب میں فارسی اور ہندی کے درمیان بڑا خوشگوار توازن قائم کیا ہے۔ نمونہ کلام:

> توتے نے کہا کہ ایک گیدر تھا کہ وہ ہمیشہ شہر میں جاتا اور ہر ایک آدمی کے باسنوں منہ میں ڈالتا؟ چنانچہ اسی اپنی عادت سے ایک تات نیل گر کے گھر گیا اور اس کے نیل ماٹ میں منہ ڈالتے ہی اس میں گر پڑا اور تمام بدن اس کا نیلا ہو گیا۔۱۶

آرائش محفل حیدری کی دوسری مشہور اور مقبول ترین کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے عبداللہ نے فارسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب حاتم نامہ کو آرائش محفل کے نام سے ۱۸۰۳ء میں ترجمہ کیا ہے ۔آرائش محفل ایک داستان ہے جس میں اخلاق اور عمل صحیفہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ اس داستان میں اشیاء ،حب انسانی ،یعنی انسانی دوستی اور خدمات خلق بھی موضوع کیا ہے۔عام داستانوں کی طرح آرائش محفل کا پلاٹ غیر مربوط اور وحدت سے عاری ہے۔اس میں حاتم طائی کا سات میموں کا ذکر کیا گیا ہے۔اسی داستان کا مرکزی کردار حاتم ہے۔وہ بہادری، جفاکشی، جرئت و ہمت، سخاوت و مروت، حسن و اخلاق اور نیکی کی پیکر ہے۔حاتم کی زندگی کا نصب العین دوسروں کو مدد کرنا ہے۔حاتم طائی کے علاوہ اس قصے کے اہم کرداروں میں حسن بانو اور بادشاہ کے پیر کے کردار بہت دلچسپ اور نمایاں ہے۔

آرائش محفل کے اکثر جملوں میں فارسی زبان کی اثرات ہیں۔اس کے علاوہ روزمرہ محاورہ کا بڑا خوشگوار توازن پیش کیا ہے۔آرائش محفل میں سراپا نگاری، جزئیات نگاری اور مناظر فطرت کا بیان نمایاں

ہیں۔ اگر چہ یہ ایک داستان ہے مگر اس میں ہندوستانی تہذیب، رسم ورواج اور تاریخی واقعہ کا ذکر بھی موجود ہے۔

قصہ لیلی مجنوں حیدری کی ایک اہم نثری کتاب ہے۔ اس قصے کا ماخذ امیر خسرو کی مثنوی لیلے مجنوں ہے۔ حیدری کے قبل یہ قصے کو خواجہ حسین شاہ جہاں آبادی نے اردو نظم میں بیان کیا تھا۔ بعد میں یہ کتاب کو ۱۸۰۱ء میں حیدری نے اردو نثر میں منتقل کیا۔ اس قصے کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔

گلزار دانش حیدری کی اردو نثری ترجمہ ہے۔ ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۸۰۴ء میں حیدر بخش حیدری نے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا اور ان کا نام گلزار دانش دیا۔

اس قصے میں شہزادہ جہاندار سلطان اور مہرور کے عشق کے داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے اسلوب بیان سے ترجمہ پن کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ انکی زبان بے حد گنجلک اور پر تعقید ہے۔ حیدری کی رنگیں بیانی بے کیف ہے۔

تاریخی نادری حیدر بخش حیدری کی اردو میں ترجمہ شدہ ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں نادر شاہ کے مفصل حالات زندگی اور واقعات بیان کیا گیا ہے۔ اس کتابط کا اصل نام تاریخ جہاں کشائے نادری ہے۔ اب یہ کتاب تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے۔ مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ گل مغفرت، ہفت پیکر، گلدستہ حیدری، گلشن ہند وغیرہ ان کا قابل قدر اردو ترجمہ شدہ کتاب ہے۔

### مرزا علی لطف

مرزا علی لطف فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سے ایک تھے۔ ان کا اصل نام مرزا علی اور لطف ان کا تخلص تھا۔ ان کا والد کا کاظم علی بیگ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انکی غزلوں میں شیرنی شستگی بھی۔ سوز و گداز بھی اور تاثیر موجود ہے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ اردو نثر میں ترجمہ شدہ کتاب تذکرہ گلشن ہند ان کا مشہور کارنامہ ہے۔ یہ کتاب گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں مرتب کیا۔ یہ نواب علی ابراہیم خان کا تذکرہ گلزار ابراہیم

سے بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ نایاب ہے، یہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس وجہ سے کہ اس زمانہ کا طرز تحریر اس وقت کے مشہور شاعروں کے دلچسپ حالات جن سے مصنف کی ملاقت ہوئی اور اس وقت کی سوسائٹی کے مرقع اس میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نواب اسطو جاہ کی مدح میں کئی قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ خلاصۂ کلام، صحف ابراہیم، حالات سرکش ولی، بنارش اور مجموعۂ خطوط قابل ذکر تصنیف ہیں۔ ۱۸

**مولوی امانت اللہ:**

مولوی امانت اللہ بھی فورٹ ولیم کالج کا ایک اہم منشی تھے۔ ان کا تخلص شیدا تھا۔ انہوں نے کپتان جیمس مرنٹ کے فرمائش پر اخلاق جلالی کا اردو میں ترجمہ ۱۸۱۵ء میں جامع الخلائق کے نام سے کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں جیمس مرنٹ اور گورنر جنرل ویلزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی امانت اللہ صاحب کے ہدایت الاسلام کے نام اور ایک مفید اور قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ یہ عربی اور اردو زبان میں لکھی ہوئی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ گل کرسٹ نے کیا ہے۔ ہدایت الاسلام کا موضوع احکام شرع ہے۔ اس میں انہوں نے ایمان مفصل اور مجمل سے لے کر وضو کرنے طریقیت مختلف مواقع کی نمازوں خطبوں کے ذکر کے علاوہ دیگر مسائل اور قوانین کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک منظوم صرف ونحو اور موسوم بہ صرف اردو اور جامع الاخلاق تصنیف کی۔ ۱۹

**مظہر علی خان ولا:**

مظہر علی خان ولا فورٹ ولیم کالج کے ایک میر منشی تھی۔ ان کا اصل نام مظہر علی خان اور ولا تخلص ہے۔ ان کے والد کا نام سلیمان علی خان تھا۔ ان کے اباو اجداد اصفہان سے دہلی آئے۔ ۱۸۰۰ء میں انہوں نے مارکوس ویلزلی کی دعوت پر کرنل اسکاٹ کے ذریعہ فورٹ ولیم کالج میں ملازمت اختیار کیا۔ انہوں نے گل کرسٹ کے حکم سے ۱۸۰۱ء میں مادھونل، بیتال پچیسی اور ہفت گلشن کا اردو ترجمہ کیا۔ ولا ۱۸۰۰ء

میں کلکتہ آئے اور چیف سکریٹری سے ملاقات کی اور ان کے حکم سے گل کرسٹ سے ملکر شعبہ ہندوستانی میں وابستہ ہو گئے۔ ان کتابوں کے علاوہ ولا پند نامہ منظوم (۱۸۰۲ء) لطائف وظرائف، تاریخ شیر شاہی (۱۸۰۵ء) جہانگیر شاہی (۱۸۰۹ء) کے مصنف اور مترجم تھے۔۲۰

مادھونل اور کام کندلا مظہر علی خان ولا کا سب سے پہلا تالیف ہے۔ یہ ہندی زبان کا ایک عاشقانہ قصہ ہے۔ ان میں ایک برہمن مادھونل اور رقاصہ کندلا کے عشق ومحبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد انہوں نے حضرت شیخ سعدی، سراجی کا پند نامہ کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ سعدی کا بہت مشہور ومعروف منظوم رسالہ ہے اور اردو میں ابتک اس کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں ہفت گلشن ناصر علی خان بیلگرامی کی فارسی تالیف ہے اور اس کتاب کو ولا نے گل کرسٹ کے فرمائش پر ہفت گلشن کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں لکھی تھی ہفت گلشن اخلاق اور پند نصائح پر مبنی حکایت کا ایک مجموعہ ہے ہفت گلشن سے پند ونصیحت کے جو نکات ظاہر ہوتے ہیں وہ حیات

انسان کے ہر پہلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ موضوع کے علاوہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اسکی بے حد سادہ سلیس، رواں اور شگفتہ زبان ہے۔اس میں مستقل روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ نے عبارت میں دلکش پیدا کردی ہے۔

اتالیق ہندی بھی مظہر علی خان ولا کا ایک مشہور کتاب ہے۔ یہ گل کرسٹ کی نگرانی سے مرتب کی تھی۔ یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں اخلاق اسباق وحکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کے اور ایک مشہور کتاب بیتال پچیسی ہے۔ یہ کتاب پہلے سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہے۔ ولا نے ۱۸۰۳ء میں اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا۔اس میں بے تال کے نام سے ایک شخص کی کہانی بیان کی گئی ہیں۔ ان کا سب سے تاریخی یادگار کارنامہ تاریخ شیر شاہی ہے۔ یہ شیر شاہ سوری افغانی بادشاہ دہلی ۱۵۴۵ء تا ۱۵۶۰ء کے عہد کی مکمل تاریخ ہے۔اس کے علاوہ جہانگیر نامہ بھی ان کا ایک اہم کتاب ہے۔۲۱

**مرزا کاظم علی جواں:**

مرزا کاظم علی جواں بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں سے ایک اہم منشی تھے۔ وہ دہلی کے باشندے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں جواں کلکتہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر جواں گل کرسٹ کی خدمت میں حاضری دی اور مترجم کے عہدے پر فائض ہوئے۔ بعد میں انکو فورٹ ولیم کالج کے سکنڈ منشی کا عہدہ ملا۔ کاظم علی جواں سب سے پہلی کتاب کا نام سکھلا نا تک ہے۔ جو ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا بعد میں انہوں نے سنگھا سن بتیسی (۱۸۰۱ء) کا ترجمہ کیا تھا۔ وہ ترجمہ قرآن شریف کے معاونین میں شامل تھے۔ بارہ ماسہ جواں کی منظوم تصنیف ہے۔ انہوں نے تاریخ فرشتہ ۱۸۰۷ء میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ انتخاب سودا اور کلیات میر مر تبیں میں شامل تھے۔ ۲۲

مندرجے بالا منشیوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کی ترقی میں جنہوں نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں سے سید جعفر علی رواں لکھنوی، افتخار الدین شہرت، مرزا ہاشم علی عیان، مرزا قاسم علی ممتاز، شیخ حفیظ الدین احمد، مولوی اکرام علی، خلیل علی خان اشک، میر عبداللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غرض یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو نثر کی فروغ دینے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کالج نے نہ صرف اردو نثر کی ترقی میں فرائض انجام کی بلکہ آئندہ کے لئے ایک رہ نکالا۔ جس کے ذریعے اردو زبان دنیا کی بہترین اور مقبول ترین زبان ثابت ہوگئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی وکشش سے اردو نثر نے ایک نئی دور میں شامل ہوا۔ انہوں نے ملک کے گوشے گوشے سے ارباب علم و ہنر دعوت دی۔ ان کے ذریعے آسان اور سلیس اردو زبان میں کافی ذخیرہ پیدا کیا۔ اردو زبان کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج کی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

**حوالہ جات :**


۱۔ عظیم الحق جنیدی، اردو ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہائس علی گڑھ ۲۰۱۳ء، صفحہ ۱۹۱۔۱۹۰

۲۔ سید محمد اصیم، اردو ادب کی تاریخ، تاج پرنٹس دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۔۳۱

۳۔ایضا،صفحہ۳۱۔۳۰

۴۔عتیق صدیقی،گل کرسٹ اوراس کے عہد انجمن ترقی اردو علی گڑھ اشاعت اردو۱۹۶۰ء،صفحہ۱۳۳

سید محمد اصیم ،اردو ادب کی تاریخ، صفحہ۱۴۵۔۱۴۴

۵۔سید محمد اصیم ،اردو ادب کی تاریخ،صفحہ ۱۴۷

۶۔ڈاکٹر واحد قریشی،کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ،لاہور،۱۹۷۲ء،صفحہ۲۶۸

۷۔ڈاکٹر انوار سعید،اردو ادب کی مختصر تاریخ،ایم۔آر۔پبلکشن،نیو دہلی، ۲۰۱۳ء،صفحہ۲۳۰

۸۔ایضا،صفحہ ۲۳۰

۹۔ڈاکٹر واحد قریشی،کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ،صفحہ۱۹۳

۱۰۔ڈاکٹر انوار سعید،اردو ادب کی مختصر تاریخ،صفحہ۲۳۰

۱۱۔ایضا،صفحہ ۲۲۷

۱۲۔ڈاکٹر سہیل بخاری،باغ و بہار پر ایک نظر، لاہور۱۹۶۸ء،صفحہ۲۴

۱۳۔ ڈاکٹر انوار سعید،اردو ادب کی مختصر تاریخ،صفحہ ۲۲۹۔۲۲۸

۱۴۔ایضا،صفحہ ۲۲۹۔۲۲۸

۱۵۔ڈاکٹر عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،نصرت پبلکشن،لکھنو،۱۹۷۶ء،صفحہ۱۳۳

۱۶۔عبدالغفور نساخ،سخن شعراء،نول کشور پریس،لکھنو، ۱۹۲۱ء،صفحہ۱۱۹

۱۷۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،صفحہ۱۳۷۔۱۳۵

۱۸۔پروفیسر نورالحسن نقدی،تاریخ ادب اردو،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۴ء،صفحہ۲۷۳

۱۹۔ڈاکٹر عبیدہ بیگم،فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات،صفحہ۱۷۱۔۱۷۰

۲۰۔ایضا صفحہ۱۴۵۔۱۴۱

۲۱۔ پروفیسر نورالحسن نقدی،تاریخ ادب اردو،صفحہ۲۷۱

۲۲۔ایضا،،صفحہ۲۷۱

# ہندوستان میں اکیسویں صدی کے نمائندہ ادبی رسائل

ڈاکٹر ریحان حسن ☆

جس طرح ہاتھی خریدنا آسان ہے لیکن اسے اسے پالنا بہت مشکل ہے اسی طرح کسی مجلّہ، رسالہ یا خبر رنامہ کا جاری کرنا سہل ہے لیکن اسے قائم رکھنا بہت دشوار ہے کیوں کہ اردو رسائل اور مجلوں کو نکالنے میں متعدد نوعیت اور مختلف انداز کی پریشانیوں کا مسلسل سامنا پڑتا ہے ایسے میں اس کا باقی رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں پر مغز مضامین کی تحصیل، مالیات کی فراہمی، قارئین کے ذوق وشوق کی برابر کمی جیسے ہمت شکن مصیبتیں اژدھے کی طرح پھنکارتی ہیں جن کا مقابلہ کرنا بڑے ہی قلب وجگر اور بلند ہمتی کا کام ہے لیکن ایسے ماحول میں بھی بعض ایسے رسائل ہیں جنہوں نے ایک صدی یا اس سے زائد کی عمر حاصل کر لی ہے۔ ان رسائل میں عوامی اور ادبی پرچہ ''رہنمائے تعلیم'' بھی ہے جو فی الوقت ''رہنمائے جدید تعلیم'' کے نام سے 113 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اِس کے علاوہ معارف اور اصلاح نے بھی ایک صدی کا سفر طے کر لیا ہے۔

اکیسویں صدی کے نمائندہ رسائل میں وقیع رسالہ دہلی سے نکلنے والا ماہنامہ ''آجکل'' ہے جو اپنی اشاعت کے 75 سال پورے کر چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے جب انگریزی سامراجیت کو خطرہ درپیش ہوا تو انہوں نے ہندوستان کی مظلومیت کو اسلامی ممالک اور سرحدی علاقوں میں پروپیگنڈہ کرنے کیلئے ایک ادارہ یونائیٹڈ پبلی کیشنز کے نام سے قائم کیا اور اس ادارے سے نن پرون کے نام سے 1941 مین پشتو زبان میں ایک رسالہ جاری کیا اور بعد میں اس کا اردو ایڈیشن بھی اسی نام سے شائع ہونے لگا بالآخر

---

☆ شعبۂ اردو و فارسی، گورو نانک دیو یونیورسیٹی، امرتسر، انڈیا

نومبر 1942 کے شمارے کو ''آج کل'' کا نام دیا گیا ۔1943 سے یہ رسالہ باقاعدہ ''آج کل'' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ یہ رسالہ مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔لدھیانہ کے آغا محمد یعقوب وداشی کی ادارت میں( یکم جون 1943 تا یکم اکتوبر 1946) یہ رسالہ اس قدر مقبول ہوا کہ ادبی جریدوں میں اس کی منفرد شناخت بن گئی اور جوش ملیح آبادی کی ادارت (اگست 1948 تا دسمبر 1955 ) میں سالنامے بڑی آن بان اور شان سے نکلے لیکن وہ سات سال ادارت کے فرائض انجام دینے کے بعد 1955 کے آخر میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس عہد میں کشمیر نمبر کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جوش کے بعد عرش ملسیانی نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور سالناموں کی رسم 1955 میں ٹوٹی اور 1956 میں ایک خاص نمبر ہندوستانی موسیقی کے موضوع پر شائع ہوا جس کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کا یہ کہنا تھا:

''آج کل کا موسیقی نمبر ایک کارنامہ ہے۔ اردو ادب میں فن موسیقی کے متلق عام فہم انداز میں ایسے اچھے مضامین اور ممتاز موسیقاروں کے متعلق ایسی معلومات مشکل سے کہیں اور یکجا ہوئی ہوں گی۔''

(عرش ملسیانی، آج کل کے اٹھائیس برس، کور 3 ،جلد 75، جولائی 2017 )

آج کل نے کشمیر نمبر کے علاوہ 1948 میں گاندھی نمبر، 1956 میں گوتم بدھ نمبر 1959 میں جنگ آزادی نمبر، 1958 میں ابوکلام آزاد نمبر 1959 میں رقص نمبر، 1960 میں ہندوستانی مصوری نمبر 1962 میں فن تعمیر نمبر 1971 میں فلم نمبر، مصوری نمبر، لوک گیت نمبر، 2013 میں ہندوستانی سینیما کے سو سال، 2014 میں خواجہ احمد عباس نمبر، اردو صحافت نمبر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی نمبر جوش ملیح آباد نمبر، بلونت سنگھ نمبر، جذبی نمبر وغیرہ اور بیشمار خصوصی گوشے بھی شائع کئے۔ اس کے علاوہ ادب، تنقید، ڈرامہ، موسیقی، سائنس غرض کہ ہر طرح کے علمی و ادبی موضوعات پر ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں کہ جس کے مطالعہ کے بغیر علمی و ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ آج کل کے 75 سال پورے ہونے پر جولائی 2017 کا شمارہ ''ڈائمنڈ جبلی نمبر کے طور پر شائع کیا گیا۔ ماہنامہ ''آج کل'' کی ابتدا 1942 سے 2000 تک کے شماروں کا اشاریہ ڈاکٹر جمیل اختر نے مرتب کیا جو 2002 میں شائع ہوا۔

مختصر یہ کہ اس رسالہ میں علم وفن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جو موجود نہ ہو۔ رسالہ کو بلندیوں تک پہ و نچانے میں آغا محمد یعقوب وداشی، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، شہباز حسین، راج نرائن راز، محبوب الرحمٰن فاروقی ،عابد کرہانی، ڈاکٹر محمد کاظم، خورشید اکرم، حسن ضیا اور ڈاکٹر ابرار رحمانی کا اہم کردار ہے۔

قومی اردو کونسل سے نکلنے والا رسالہ ''فکر و تحقیق'' کی ادبی دنیا میں منفرد شناخت ہے۔ 1989ء میں جنوری تا جون کا شمارہ ششماہی نکلا دسمبر 1992 تک ششماہی کے طور پر شائع ہوتا رہا تین برس تک اس کی اشاعت موقوف رہی لیکن:

''ترقی اردو کونسل میں ضم کرنے کے بعد'' فکر و تحقیق کا پہلا شمارہ جنوری 1997ء میں شائع ہوا اور اس رسالہ کو جولائی 1998ء میں سہ ماہی کر دیا گیا۔ ( ڈاکٹر عبدالحئ، اکیسویں صدی میں اردو صحافت، مرتب ڈاکٹر امام اعظم، صفحہ 28)

فکر و تحقیق اپنی اشاعت کے اول روز سے ہی عاشقان ادب کے لئے سرمۂ بصر بنا ہوا ہے خصوصا داغ دہلوی ،فیض، میراجی، راجندر سنگھ بیدی، فکر و فن، نئی غزل، نئی نظم، نیا افسانہ نمبر، ناول نمبر، خاکہ نمبر کو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ رسالہ کے مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحئ نیز معاونین ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری ہیں۔ اسی ادارہ سے ''اردو دنیا'' بھی شائع ہوتا ہے یہ رسالہ جولائی تا دسمبر 1997 میں شائع ہوا ابتداء میں یہ رسالہ سہ ماہی تھا بعد میں ماہانہ ہو گیا۔ 2011ء سے یہ رسالہ رنگین صفحات پر بڑے سائز میں نکلتا ہے۔ رسالہ میں ادبی مباحث، تہذیب و ثقافت، صحافت، طب ،سائنس، کمپوٹر اور فلمی دنیا سے متعلق مضامین بھی ہوتے ہیں نیز مشہور شخصیات کے انٹرویو، کتابوں پر تبصرے اور اردو دنیا کی خبریں بھی ہوتی ہیں خصوصا طلاب کرام سے متعلق مضامین کو رسالہ میں اہمیت حاصل ہے ۔رسالہ نے خصوصی گوشوں کے ادبی دنیا میں انبار لگا دئے ہیں ۔رسالہ میں کوراسٹوری کے تحت نئے موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں جو خاصہ کی چیز ہیں۔ فی الوقت رسالہ کے مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحئ ہیں۔ قومی اردو کونسل سے ماہنامہ ''خواتین کی دنیا'' بھی شائع ہو رہا ہے جس میں تانیثی ادب سے قارئین کو واقف کرانے کے ساتھ ساتھ خواتین قلمکاروں کی تخلیقات کو بھی ترجیح دی جاتی ہے۔

ہندوستان میں اکیسویں صدی کے نمائندہ ادبی رسائل

اکیسویں صدی تک اپنا طولانی سفر طے کرنے والے رسائل میں ''دین دنیا'' دہلی بھی ہے۔ مفتی شوکت علی فہمی 1993 میں اس ادارہ سے وابستہ ہوئے، یہ جریدہ اصلا مسلمانوں کی اصلاح کی غرض سے منظر عام پر آیا لیکن ادبی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جس کا سلسلہ ہنوز برقرار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شوکت علی فہمی نے 1993 تک اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانوں کی خوب رہنمائی کی اب ان کے بیٹے آصف فہمی کی ادارت میں یہ رسالہ تقریبا 97 سال کی عمر پورا کر رہا ہے۔

غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی سے 2006ء سے عقیل احمد کی ادارت میں ششماہی ''جہاں غالب'' شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ میں غالبیات کے حوالے سے وقیع مضامین ہوتے ہیں۔ نیز غالب انسٹی ٹیوٹ سہ ماہی جریدہ ''غالب نامہ'' نکلتا ہے جسے غالبیات کی تفہیم میں اولیت حاصل ہے ۔رسالہ سے خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے ہیں جن میں پروفیسر احتشام حسین نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، علی سردار جعفری نمبر، علامہ اقبال نمبر حالی نمبر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں فی الوقت ڈاکٹر رضا حیدر کی ادارت میں رسالہ کا سفر جاری ہے۔

دہلی سے محمد عارف اقبال کی ادارت میں نومبر 1995 سے ''اردو بک ریویو'' شائع ہونا شروع ہوا جس میں قلمکاروں کے تعارف کے ساتھ ساتھ وفیات کا کالم بھی ہوتا ہے نیز موضوع کے اعتبار سے نئی کتابوں کا تعارف بھی اور اردو کے مجلّات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس طرح اردو میں یہ اپنی نوعیت کا الگ اور پہلا رسالہ ہے۔ اسی شہر سے 2000 میں سہ ماہی ''استعارہ'' صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی کی ادارت میں شائع ہوا۔ رسالہ ادبی سیاست سے پاک ہی نہیں بلکہ اردو ادب پر جمود کو ختم کرنے میں بھی پیش پیش رہا۔ افسوس کہ 2007 میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ حقانی القاسمی نے یک موضوعی مجلّہ ''انداز بیاں'' بھی نکالا جسے صحافتی ادب میں ایک خوشگوار اضافے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ 2016 میں پہلا شمارہ خواتین کی خود نوشتوں کے جائزہ پر محیط تھا۔ دو سال کے طویل انتظار کے بعد دوسرا شمارہ ''پولیس کا تخلیقی چہرہ'' 2018 میں شائع ہوا ہے جس میں پولس محکمے سے وابستہ افراد کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ شمارہ 9 ابواب پر مشتمل ہے جس کی ضخامت 471 صفحات ہے ۔ یہ دونوں شمارے انفرادیت، جدت اور مدیر کی

فکری بصیرت کا ثبوت ہیں۔

سہارا انڈیا پریوار کی جانب سے ادبی جریدہ ''بزم سہارا'' 2010ء میں شائع ہونا شروع ہوا ۔جس میں خراج عقیدت، جہاں آگہی، کتاب کی کائنات، گلستان سخن، فن اور فنکار کے عنوان سے مضامین اور نظمیں طبع ہوتی تھیں۔اس کے علاوہ افسانے، پردۂ سیمیں اور اردو دنیا کی تہذیبی اور ثقافتی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں نیز اس ادارہ سے ہفتہ وار ''عالمی سہارا'' بھی شائع ہوتا ہے جس میں سیاسی خبروں کے ساتھ ساتھ ''باب ادب'' کے عنوان سے ادبی مضامین نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوتی ہیں ہوتی تھیں۔افسوس کہ دونوں رسالوں کی اشاعت مسدود ہو چکی ہے۔

اردو اکادمی دہلی کے ترجمان ماہنامہ ''ایوان اردو'' کو بھی اکیسویں صدی کے ادبی رسائل میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ 1987ء میں شائع ہوا ۔اس کے ادارہ تحریر میں سید شریف الحسن نقوی اور مخمور سعیدی کے نام نامی تھے اور مجلس مشاورت میں خلیق انجم، حکیم، عبدالحمید، خواجہ حسن ثانی نظامی اور بیگم ریحانہ فاروقی تھیں۔اس رسالہ کے پہلے ایڈیٹر سید شریف الحسن نقوی تھے۔ یہ رسالہ تقریباً تیس سال سے نکل رہا ہے جس میں علم و ادب کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر مضامین شائع نہ ہوئے ہوں۔ رسالہ نے بیشمار نمبر اور خصوصی گوشے بھی شائع کئے ہیں جو دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ مارچ 2018 میں سرسید کے دوصد سالہ یوم پیدائش کے سلسلے میں 196 صفحات پر مشتمل ''سرسید نمبر'' شائع ہوا ہے جو دوصد سالہ تقریبات کے حوالے سے سرسید پر نکلنے والے رسائل میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس اہم اور ضخیم نمبر کو نکالنے میں پروفیسر شہپر رسول، ایس ایم علی محمد ہارون اور منور حسن کمال کی محنت اور لگن قابل داد ہے۔

دہلی سے 2005 میں سہ ماہی ''نیا سفر'' شائع ہوا جس کے مرتبین پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر علی احمد فاطمی تھے۔ مدیر منتظم راشد عزیز اور مدیر معاون پروفیسر شہزاد انجم اور ندیم احمد صاحبان تھے چونکہ 2005 میں سید سجاد ظہیر کے 100 ویں اور پریم چند کے 125 ویں جنم دن کا سال تھا اس لئے اس شمارہ میں سجاد ظہیر پر خصوصی گوشہ نکلا۔ رسالہ میں افسانہ، شاعری، طنز و مزاح، نقد و نظر اور معاصر ادب کے مسائل کے ساتھ ساتھ کتب و رسائل پر تبصرے بھی ہوتے تھے۔

اکیسویں صدی کے رسائل میں ایک وقیع رسالہ سہ ماہی رسالہ ''ادب سلسلہ'' بھی ہے۔ یہ رسالہ اکتوبر، دسمبر 2015 میں شائع ہوا پہلا شمارہ افسانہ نمبر ہے جب کہ ادب سلسلہ کا جنوری تا جون 2017 کا شمارہ آزاد خیال، باغی اور با اختیار خواتین کے نام منسوب کیا گیا جس میں نند کشور وکرم پر خصوصی گوشہ بھی ہے ۔ یہ شمارہ چار ابواب پر مشتمل ہے جس کے پہلے باب میں جانباز خواتین کی زندگی اور کارناموں کا ذکر ہے جب کہ دوسرے باب کا عنوان ''عورت ہوں نا'' اور تیسرے باب کا عنوان ''تانیثیت و ادب'' ہے نیز چوتھا باب ''الزامات'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے علاوہ شمارہ میں خواتین کے افسانے اور نظمیں بھی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اکیسویں صدی کے رسائل میں خواتین کے حوالے سے یہ شمارہ انتہائی وقیع ہے۔ اس کے علاوہ انتظار حسین اور سر سید احمد خاں پر بھی خصوصی گوشے شائع ہوئے ہیں۔ نیز ادب اور احتجاج نمبر بھی غیر معمولی شمارے ہیں جسے دیکھ کر مدیر محمد سلیم اور اعزازی مدیر تبسم فاطمہ کے عزم اور مستقل مزاجی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان رسائل کے علاوہ افکار ملی، ملی اتحاد، سہ ماہی اقدار، آب وگل، ھما اور ندی نے بھی ادب کی آبیاری میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ نصرت ظہیر کی ادارت میں 2006 سے سہ ماہی ''ادب ساز'' ادب کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہے۔

ریاست اتر پردیش سے نکلنے والے ادبی رسائل میں اعظم گڈھ سے نکلنے والا ماہنامہ ''معارف'' کی طولانی عمر ہے۔ اسے علامہ شبلی نعمانی کے جانشین سید سلیمان ندوی نے جولائی 1916 میں دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) سے جاری کیا تھا جس میں ادبی وتنقیدی نگارشات بڑے ہی اہتمام کے ساتھ شائع ہوتی آرہی ہیں۔ ماہنامہ معارف نے سو سال کے عرصہ میں تقریباً چار ہزار مضامین ومقالات مختلف موضوعات پر شائع کئے ہیں۔ معارف کے ہر شمارے کا پہلا مقالہ سرمقالہ کہا جاتا ہے جو عموماً علم وتحقیق کے کسی عنوان سے متعلق ہوتا ہے۔ معارف کے مشمولات میں ایک اہم ''باب الاستفسار والجواب'' بھی ہے جس میں اہل علم کے سیکڑوں علمی، تاریخی اور ادبی سوالات کے جوابات تحریر کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ میں ایک کالم ''مطبوعات جدیدہ'' ہے جس میں ابتداء ہی سے نئی کتابوں پر تنقید وتبصرے کا بھی اہتمام رہا ہے۔ رسالہ کا ایک مستقل عنوان ''ادبیات'' ہوتا ہے جس کے تحت نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی ہیں اب تک سات

ہزار سے زائد ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی اور علمی کتابوں پر تبصرے رقم کئے جا چکے ہیں۔ معارف کے اہم سرمایوں میں غالبیات، اقبالیات اور خطوط بھی وقیع ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ علم و ادب تخلیق و تدوین کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو معارف میں موجود نہ ہو۔

ادبی رسائل میں محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش سے نکلنے والے جریدہ ''نیا دور'' اشاعت کا 95واں سال پورا کر چکا ہے۔ دراصل یہ رسالہ پہلے ''اطلاعات'' کے نام سے شائع ہوتا تھا جس کا اجرا 1946 میں ہوا تھا لیکن بعد میں یہ رسالہ 1955ء میں علی جواد زیدی کی مساعی جمیلہ سے ''نیا دور'' کے نام سے شائع ہونے لگا جو اب تک اسی نام سے لگا تار شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کو علم و ادب، سیاسیات، نفسیات، عمرانیات، معاشیات اور علم طب وغیرہ سے متعلق مضامین کی بدولت بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ اکیسویں صدی کے رسائل میں اس رسالہ کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ 2016 تک یہ رسالہ کمپیوٹر کی کمپوزنگ کے بجائے کتابت پر شائع ہوتا رہا۔ ''ماہنامہ نیا دور'' کو ملک کے ادبی رسائل میں اس لئے بھی فوقیت حاصل ہے کہ اس رسالہ کے خصوصی نمبر اور خاص گوشوں کی تعداد سو سے زائد تجاوز کر چکی ہیں جس کی مثال اردو کی ادبی دنیا میں پاکستان کے رسالہ ''نقوش'' کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔

نیا دور کے پہلے مدیر علی جواد زیدی کی ادارت میں پانچ خصوصی نمبر شائع ہوئے جن میں گاندھی جینتی نمبر، جمہوریت نمبر، آزادی نمبر، ادب نمبر کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ بھگوتی شرن سنگھ کی ادارت میں یوم جمہوریت نمبر، اسپیشل نمبر اور جمہوریت نمبر نے علمی دنیا میں دھوم مچائی۔ نیا دور کے ابتدائی عہد میں صباح الدین عمر نے گیارہ خصوصی شمارے 1959 سے 1965 تک شائع کئے نیز سید خورشید احمد نے 65 19 سے 1979 تک انیس خصوصے شمارے یعنی جعفر علی خاں اثر نمبر، غالب نمبر، احتشام حسین نمبر۔ امیر خسرو نمبر، مسعود حسن رضوی ادیب نمبر، عبدالماجد دریابادی نمبر وغیرہ نے تشنگان علم و ادب کو سیراب کیا 1979 سے 1988 تک امیر احمد صدیقی نے بتیس خصوصی شمارے شائع کئے جن میں، منشی نولکشور نمبر بہادر شاہ ظفر نمبر، منشی دیا نرائن نگم نمبر، فراق نمبر، عثمان عارف نمبر اور یادرفتگاں نمبر علمی دنیا میں دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ نیز شاہ نواز قریشی نے ایک شمارہ قومی ہم آہنگی کے نام، ایک

شمارہ امیڈکر کے نام، ایک شمارہ شمع حریت کے نام، ایک شمارہ وامق جونپوری کے نام، اور غالب اور کیفی اعظمی پر بھی نمبر نکالے۔ سید امجد حسین نے 1992 سے 1997 تک آٹھ خصوصی شمارے شائع کیے جن میں صباح الدین عمر نمبر، قومی یکجہتی نمبر، اودھ نمبر، نصف صدی نمبر، گاندھی نمبر اور یادگار آزادی نمبر کو بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔

ماہنامہ نیا دور کی تاریخ میں امیر احمد صدیقی کے بعد ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے تو خصوصی شماروں اور گوشوں کے انبار لگا دئے۔ ان کے عہد ادارت کے 26 ضخیم نمبروں میں محمد علی جوہر نمبر، علی جواد زیدی نمبر، انقلاب 1857 نمبر، ڈائمنڈ جبلی نمبر، میر تقی میر نمبر، شکیل بدایونی نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، عرفان صدیقی نمبر، منشی دوارکا پرشاد افق نمبر، مجاز لکھنوی نمبر، خمار بارہ بنکوی نمبر، والی آسی نمبر اور میر انیس نمبر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ نیا دور کا اشاریہ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے 4 جلدوں میں 2017 تک بنا کر غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے جس کی دو جلدیں رضا رام پور لائبریری سے شائع ہو چکی ہیں۔

سرکاری رسائل میں اتر پردیش اکادمی سے نکلنے والا رسالہ ''اکادمی'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ دو ماہی ''اکادمی'' کا پہلا شمارہ علی جواد زیدی کی ادارت میں جولائی 1981 میں شائع ہوا۔ اس جریدہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آخر میں ،، ہمارے لکھنے والے ،، کے عنوان سے قلمکاروں کا تعارف ہوتا تھا'' گوشہ مدیر'' کے عنوان سے علی جواد زیدی کے اداریے ہوتے تھے جو آج بھی عاشقان ادب کے لئے خاصہ کی چیز ہیں۔ علی جواد زیدی کے عہد ادارت میں نومبر 1981 میں حسرت موہانی نمبر ستمبر اکتوبر 1983 میں فراق نمبر۔ مارچ اپریل 1984 میں جوش ملیح آبادی نمبر، مارچ اپریل 1987 میں اصغر گونڈوی نمبر اور 1982 میں افسانہ نمبر شائع ہوا جس کی اہل ادب کے درمیان بھرپور پزیرائی ہوئی۔ اس کے علاوہ جنوری تا جون 1992 میں جگر مرادآبادی نمبر، جولائی تا دسمبر 1992 میں افسانہ نمبر، جولائی تا دسمبر 1993 میں مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، جولائی تا دسمبر 1994 میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، نومبر تا اپریل 2000۔ 2001 میں حیات اللہ انصاری نمبر نیز رشید احمد صدیقی نمبر، جولائی تا دسمبر 2006 میں پریم چند نمبر، اکتوبر تا مارچ 2009۔2010 میں علی جواد زیدی نمبر، اکتوبر تا مارچ 2011 ۔2010 میں

پروفیسر محمد حسن نمبر، اکتوبر تا مارچ 2013 میں پروفیسر سید احتشام حسین نمبر، اکتوبر تا دسمبر 2013 میں ولی الحق انصاری نمبر نے تشنگان علم وادب کو سیراب کیا۔

سہ ماہی ''اکادمی'' میں علم وادب کے موضوعات پر ایسے مضامین ملتے ہیں جن سے نہ جانے کتنے ہی علمی مسائل گتھیاں سلجھتی ہیں۔ ادبی دنیا میں اس جریدہ کو باوقار بنانے والوں میں عملہ ادارت کی محنت اور لگن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ رسالہ اس قدر باوقار نہ ہوتا اگر علی جواد زیدی، ڈاکٹر عزیز الرحمن، ڈاکٹر محمود الٰہی، محمد رضا انصاری، محمد شاہد اللہ خاں اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد جیسے مدیران کا تعاون نہ ملتا اس رسالہ میں شاہ نواز قریشی، فدا حسین اور عرفان زندگی پوری کا بھی سرگرم تعاون حاصل رہا ہے۔ دراصل اکادمی کے ایڈیٹر تو سکریٹری صاحبان ہوا کرتے ہیں لیکن ادارت کی ذمہ داری معاونین رسالہ ہی انجام دیتے ہیں۔ 2011 سے 2002 تک سہ ماہی اکادمی کی ادارت کی ذمہ داری فدا حسین حسینی نے انجام دی اور 2011 سے اب تک عرفان زنگی پوری مدیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ 1981 سے 2001 تک یہ رسالہ دو ماہی نکلتا تھا اور 2002 سے اب تک اکادمی سہ ماہی نکل رہا ہے۔ اردو سے سائل میں اس رسالہ کو جو اہمیت حاصل ہے اس میں مدیران سہ ماہی اکادمی کا بھی اہم کردار ہے۔

اتر پردیش اکادمی سے ''خبر نامہ'' بھی شائع ہوتا ہے جس میں ادبی مضامین کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ خبر نامہ 1972 سے فل اسکیپ پر نکلتا تھا بعد میں ڈائری کی سائز میں شائع ہونے لگا پھر 2012 سے میگزین سائز میں نکل رہا ہے اس میں جہاں اردو سے متعلق خبریں ہوتی ہیں وہی مضامین نئی اور کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ لکھنو سے ماہنامہ ''امکان'' 2000 میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی ادارت میں شائع ہوا جس کا سفر ہنوز ملک زادہ جاوید اور پرویز ملک زادہ کی مساعیٔ جمیلہ کے سبب جاری ہے۔ اسی شہر سے ماہنامہ ''لاریب'' اور سہ ماہی ''ادبی نشیمن'' بھی ادب کی آبیاری کرنے والوں میں پیش پیش ہے۔

انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک اپنا سفر طے کرنے والے رسائل میں ''تہذیب الاخلاق'' غیر معمولی رسالہ ہے۔ اس جریدہ کا اجراء 1870 میں ہوا تھا۔ یہ پہلے دس روزہ تھا بعد میں ماہنامہ ہو گیا۔ اردو کے رسائل میں ''تہذیب الاخلاق'' کو تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم اور تہذیب و اخلاق سے مزین کرنے میں اس رسالہ کا اہم کردار رہا ہے۔ سید حامد صاحب کے دور وائس چانسلری میں اس رسالہ کا احیاء ہوا۔ اس رسالہ کے ہر سال کے اکتوبر کا شمارہ سرسید احمد خاں کے کارناموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سرسید کے دوسو سالہ تقریبات کے حوالے سے دو خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں جو سرسید اور ان کے رفقائے کار کی کاوشوں سے ہمیں واقف کراتا ہے۔ رسالہ سے بہت سے خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں جنہیں ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے لیکن ان خصوصی شماروں میں علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی کی پہلی چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم نمبر، عبدالکلام نمبر اور چار سائنسدانوں پر مشتمل خصوصی شمارہ کی اہل علم کے درمیان بیحد پذیرائی ہوئی موخرالذکر شمارہ اے پی جی عبدالکلام، نوبل پرائز انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام، ظہور قاسم اور ڈاکٹر اسلم پرویز کی خدمات اور کارناموں سے آگاہی کراتا ہے۔ تہذیب الاخلاق کو علمی دنیا میں بلندیوں تک پہونچانے کا سہرا جہاں سرسید احمد خاں کو حاصل ہے وہیں اس رسالہ کے مدیران پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر صغیر افراہیم وغیرہ کی بھی جانفشانیوں اور کاوشوں کا بھی اہم حصہ ہے۔

علی گڑھ سے نکلنے والے رسائل میں سہ ماہی ''اردو ادب'' کی خدمات بھی وقیع ہیں۔ یہ رسالہ 1950 میں شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق 1922 سے ''اردو'' کے نام سے اسے شائع کرتے تھے۔ آزادی کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے رسالہ کو علی گڑھ سے نکالنا شروع کیا۔ رسالہ میں اردو کے کلاسیکی ادب پر بیحد اہمی مضامین شائع ہوئے نیز ڈاکٹر اسلم پرویز کے اداریوں نے بھی ادبی رسائل کی بھیر میں اسے ممتاز مقام عطا کیا۔

اردو کے فروغ کے لئے بے لوث خدمت کرنے والے رسائل میں گنگوہ سے ماہنامہ ''جہاں نما'' 61 سال سے شائع ہو رہا ہے جس کے مدیر اعلیٰ زیڈ اختر اور معاون مدیر بلال سعید اختر ہیں۔ رسالہ میں

مقالات ،منقبت ،غزلیں ،نظمیں ،افسانے اور کتابوں پر نقد وقدر کے عنوان سے تبصرے اور تاثرات بھی ہوتے ہیں غرض کہ رسالہ کے جملہ مشمولات لائق تحسین ہیں۔

اکسویں صدی کے ادبی رسائل میں ایک اہم نام شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''شب خون'' بھی ہے۔ یہ رسالہ 1966 سے 2005 تک شائع ہوا، رسالہ کے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین تھے۔ دراصل اس رسالہ نے اردو زبان کے دونسلوں کی رہنمائی کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ رسالہ جدیدیت تحریک کا علمبر دار اور ترجمان تھا۔ الہ آباد ہی سے جوش لٹریری سوسائیٹی کے تحت ''جوش بانی'' بھی شائع ہوا جس کے مدیر پروفیسر علی احمد فاطمی تھے۔

ریاست اتر پردیش سے اکیسویں صدی میں نکلنے والے رسائل میں مصور ادبی ماہنامہ ''سب رنگ'' جنوری 2001 میں شائع ہوا اور ماہنامہ ''ایوان ثاقب'' جنوری 2008 نیز ماہنامہ ''زاویہ'' فروری 2008 میں جاری ہوا وصی اللہ حسینی کی اطلاع کے مطابق موخر الذکر رسالہ کا پہلا شمارہ مجاز کی شخصیت اور شاعری سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ سے دو ماہی ''گلبن'' 2003 سے شائع ہو رہا ہے۔ دراصل یہ رسالہ 1977 سے 2002 تک احمد آباد سے نکلتا تھا 2003 میں لکھنؤ سے دوبارہ جاری ہو۔ رسالہ کے مضامین افسانے اور اداریے علم وادب سے شغف رکھنے والوں کے لئے خاصہ کی چیز ہوتے ہیں ۔نیز امبیڈکر نگر سے مئی 2009 میں ''وقار ادب'' کا اجراء عمل میں آیا مگر افسوس کہ ستمبر 20014 میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔

ادبی صحافت کی تاریخ میں سرزمین بہار کا بھی گراں قدر حصہ ہے۔ ریاست بہار کے سرکاری رسائل میں اردو اکیڈمی سے ماہنامہ ''زبان وادب'' بڑے ہی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ کا پہلا شمارہ 1979 میں جاری ہوا۔ اس طرح رسالہ کی اشاعت کی اب تک مدت 39 سال ہو چکی ہے۔ رسالہ نے اب تک دو درجن سے زائد خصوصی نمبر شائع کئے ہیں جن میں شاد عظیم آبادی نمبر، وہاب اشرفی نمبر ،پرویز شاہدی نمبر، سہیل عظیم آبادی نمبر، اطفال نمبر، احمد یوسف نمبر، لطف الرحمٰن نمبر، حفیظ بنارسی نمبر، خواتین نمبر، نگار سات خواتین نمبر وغیرہ کی حلقہ ادب میں کافی پذیرائی ہوئی خصوصا 1980 میں فکشن نمبر کو ادبی دنیا

میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ رسالہ کے مدیر عام طور پر سکریٹری صاحبان ہی ہوا کرتے ہیں۔ لیکن معاون مدیر انوار محمد عظیم آبادی کی خدمات رسالہ کے لئے قابل قدر ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت بہار کے محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ سے اردو رسالہ ''بہار کی خبریں'' (موجودہ نام بہار) بھی شائع ہوتا ہے جس کا یوم جمہوریہ اور یوم آزادی کے موقع پر شائع ہونے والا رسالہ صوری اور معنوی اعتبار سے اچھا ہوتا ہے۔

پٹنہ یونیورسیٹی سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی ادارت میں ''اردو جرنل'' 2010 سے نکل رہا ہے۔ پہلا شمارہ دبستان عظیم آباد اور اردو ادب میں طنز ومزاح تھا۔ 2011 میں فیض، مجاز، اور سہیل پر مشترکہ شمارہ شائع ہوا، 2012 میں سعادت حسن منٹو اور غیر افسانوی نثر پر دو گوشے شائع ہوئے، 2014 میں تحقیق وتنقید اور ہمعصر افسانہ نمبر شائع ہوا، 2015 میں ہم عصر اردو ناول نمبر، 2017 میں ہم عصر اردو شاعری اور اردو تنقید نمبر کی اشاعت عمل میں آئی جس کی ضخامت 400 صفحات تھی۔ حال ہی میں خصوصی مطالعہ ہم عصر اردو شاعری نمبر شائع ہوا ہے۔ بلاشبہ اردو جرنل کے یہ خصوصی گوشے اور نمبر ڈاکٹر جاوید حیات اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے علم وادب کے فروغ میں کاوشوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی سے علمی وتحقیقی جریدہ سہ ماہی ''دیوان'' ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد کی سرپرستی میں جاری ہوا جس میں عرفانیات، ادبیات، شعریات اور میزان کے تحت تبصرے، مقالے، غزلیں، اور نظمیں ہوتی ہیں لیکن ادبیات کے ساتھ ساتھ تصوف سے متعلق مضامین کو اولیت دی جاتی ہے۔ بہار سے وہاب اشرفی کی ادارت میں ''مباحثہ'' شائع ہوتا تھا جس کی اشاعت مسدود ہو چکی ہے۔ ہزاری باغ سے ''افق ادب'' اب بھی نکلتا ہے کہ جس کا ادب کی آبیاری میں اہم حصہ ہے۔

ریاست بہار کا ایک قابل ذکر رسالہ ماہنامہ ''سہیل'' گیا بھی ہے۔ اس رسالہ کا اجراء جنوری 1939 میں حکیم محمد طہ کمال ندوی کی ادارت میں ہوا تھا۔ سرپرست بسمل سنسہاروی تھے۔ ادبی دنیا میں رسالہ کی وقعت اس کے خاص نمبروں اور گوشوں کی وجہ سے ہے۔ رسالہ نے آغاز میں ہی 1940 میں خاص نمبر، افسانہ نمبر اور جمیل مظہری نمبر نکالے، اس کے علاوہ 1966 میں بسمل سنسہاروی نمبر، 1969 میں بھاگلپور کا

موجودہ ادبی ماحول نمبر نیز پریم چند فن اور شخصیت نمبر، سہیل عظیم آبادی، کیفی اعظمی، احتشام حسین، سالک لکھنوی علی سردار جعفری، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ پر خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ ماہنامہ سہیل نے ایک شمارہ پروفیسر شمیم نکہت کے نام، ایک شمارہ پروفیسر یوسف تقی اور سلطان احمد کے خدمات پر مشتمل نمبر بھی نکالے۔ رسالہ نے ادباء پر نمبروں کے علاوہ کثیر تعداد میں خصوصی گوشے بھی شائع کئے۔ شاہد ساز کی اطلاع کے مطابق ماہنامہ ''سہیل'' گیا کا آخری شمارہ 2005 میں حسن نواب حسن نمبر شائع ہوا پھر یہ رسالہ کلکتہ سے شائع ہونے لگا 2012 میں پرویز شاہدی نمبر کا اجراء ہوا۔ اس وقت رسالہ کے مینیجنگ ایڈیٹر جمیل منظر تھے جب کہ مدیر اعزازی ڈاکٹر شاہد ساز اور عاصم شہنواز شبلی تھے۔ 2014 سے 2016 تک ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ 2017 سے شاہد ساز کی ادارت میں ماہنامہ ''سہیل'' کلکتہ کا سفر جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اردو زبان میں ہر رسالہ معارف، دین فہمی، شاعر، آج کل، نیا دور، اصلاح (کھجوہ) الجواد (بنارس) الندوہ، تعمیر حیات، الواعظ (لکھنؤ) وغیرہ جیسی تقدیر لے کر نہیں آتے کہ جن کا علمی و ادبی سفر بہت طویل ہوتا ہے۔ بلکہ اردو زبان میں رسالے جس قدر جلد نکلتے ہیں اتنی ہی جلد بند بھی ہو جاتے ہیں لائق تحسین ہیں وہ افراد جو اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھ کر اپنے قدم کو پیچھے نہیں ہٹاتے ایسے ہی رسائل میں ضلع سیوان گوپالپور سے نکلنے والہ رسالہ سہ ماہی ''ادراک'' کو بھی ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ رسالہ کے مدیر اعزازی ڈاکٹر سید حسن عباس ہیں۔ دراصل یہ جریدہ جولائی 1982 میں مظفر پور سے شائع ہونا شروع ہوا ابھی تین ہی شمارے نکل پائے تھے کہ مالی بحران کا شکار ہو گیا لیکن ڈاکٹر حسن عباس نے ہمت نہ ہاری اور کمر کس کر دوبارہ گوپالپور سے رسالہ کو شائع کرنا شروع کیا جس کا ادبی سفر جاری ہے۔ رسالہ میں نقد و نظر کے عنوان سے مقالات، جذب دروں کے تحت منظومات، تعبیر نو کے تحت افسانے، حدیث دل کے عنوان سے غزلیات اور پیمانے کے تحت کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں نیز چھیڑ خوباں اور ہم عصر قلمکار کے مستقل عنوان کے تحت طنز و مزاح اور مختلف علوم و فنون کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے قلمکاروں کے کوائف اور تخلیقات بھی شائع کی جاتی تھیں یعنی جب تک یہ رسالہ مظفر پور سے

شائع ہوتا رہا تو اردو زبان و ادب سے مختص رہا لیکن جب گوپالپور سے شائع ہونا شروع ہوا تو اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبان وادب کے بھی علمی کارناموں کو دائرہ کار میں رکھا اور مخطوطہ شناسی ،کتبہ شناسی، مکتوبات، یادرفتگاں اور علمی مراکز وغیرہ کا اضافہ کیا ۔رسالہ کو اہل ادب کے درمیان مقبولیت اس کے خاص نمبروں کی وجہ سے بھی ہے۔جن میں 2005 حکیم ظل الرحمٰن نمبر, 665 صفحات پر مشتمل 2010 میں حنیف نقوی نمبر، 312 صفحات پر مشتمل 2015 میں فصیح الدین بلخی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ''ادراک'' گوپالپور کے آیندہ خصوصی شمارے جو زیر ترتیب ہیں ان میں احمد جمال پاشا، شاد عظیم آبادی، قاضی عبد الودود،، پروفیسر نذیر احمد ،پروفیسر مختا رالد ین احمد ،پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر سید حسن، اور ڈاکٹر ضیاءالدین دیسا ئی وغیرہ منتظر اشاعت ہیں۔

دربھنگہ سے ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں مارچ 2001 سے ماہنامہ ''تمثیل نو'' شائع ہوتا ہے جس کے خصوصی شماروں اور گوشوں نے ادبی دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، اسی شہر سے سہ ماہی ''جہاں اردو'' کا بھی اجراء ہوا۔جس میں جہان تنقید وتحقیق، جہان افسانہ، جہان شعر، جہان کتب، جہان تلخ وشیریں اور خصوصی مطالعہ کے تحت مضامین اور تبصرے ہوتے ہیں جو شائقین علم وادب کے علم میں اضافہ کا سبب ہیں۔نیز ''تحقیق دربھنگہ'' اور سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمز'' نے بھی اپنے علمی اور ادبی مشمولات کی بدولت ادبی رسائل کی بھیڑ میں منفرد شناخت بنائی ہے۔حال ہی میں ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں ''دربھنگہ ٹائمز'' کا اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر شائع ہوا ہے جو اہل ادب کے لئے سرمہ بصر ہے۔

ریاست جھارکھنڈ رانچی سے بے باک ادب کا ترجمان 2014 سے ''عالمی انوار تخلیق'' بڑے ہی آب وتاب سے شائع ہو رہا ہے رسالہ کو دیکھ کر مدیر ''عالمی انوار تخلیق'' ڈاکٹر ایم۔اے۔حق کی محنت اور لگن پر رشک آتا ہے رسالہ میں مضامین قابل رشک، افسانے اور افسانچے کا انتخاب عمدہ اور نظمیں وغزلیں پسندیدہ ہوتی ہیں۔اس کے علاوہ رسالہ میں ایک نثر اور ایک شعری صنف کا تجزیہ بھی ہوتا جس کے تجزیہ نگار کا نام مخفی رکھا جاتا ہے تا کہ تخلیق پر رائے غیر جانب دار آسکے۔اکیسویں صدی کے رسائل میں یہ طریقہ کار مستحسن ہی نہیں بلکہ منفرد بھی ہے کیونکہ اس طریقہ کار سے اعلی اور اچھے ادب کے لئے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔جنوری

2018 کے شمارے میں اردو ادب کی چودہ نمائندہ کہانیوں کا انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ رسالہ ادب کا ترجمان ہی نہیں بلکہ اردو کی ایک تحریک بھی ہے۔ ہزاری باغ سے سہ ماہی ''افق ادب'' اب بھی نکلتا ہے کہ جس کا ادب کی آبیاری میں اہم حصہ ہے۔ اس کے علاوہ جھارکھنڈ سے نکلنے والے رسائل میں دنباد سے ''رنگ'' اور ''شہپر'' جھریا سے ''دسترس'' رانچی سے ''امید سحر'' وغیرہ نے اردو کی ترویج میں حصہ لیا۔ نیز ''موج ادب'' بھی نکلتا تھا جو کہ اب بند ہو چکا ہے۔

ادبی رسائل میں بیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک اپنا سفر طے کرنے والے رسائل میں ممبئی سے نکلنے والے ماہنامہ ''شاعر'' کے ذکر کے بغیر اکیسویں صدی کی صحافت کی تاریخ نامکمل ہے۔ اس رسالہ کا اجراء 1930 میں آگرہ میں ہوا لیکن 1950 میں ممبئی شہر سے شائع ہونے لگا جس کی اشاعت کا سلسلہ اپنی اشاعت کے 88 سال کی طویل عمر طے کر چکا ہے۔ جس کی ادارت افتخار امام صدیقی بخوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس شہر کے رسائل میں ایک غیر معمولی رسالہ ''نیا ورق'' بھی ہے جس کے مدیر ساجد رشید تھے اب یہ رسالہ ان کے صاحب زادے شاداب رشید کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ نیز انجمن اسلام (ممبئی) سے ''نوائے ادب'' نجیب اشرف نے جاری کیا تھا اب یہ رسالہ پروفیسر عبدالستار دلوی کے زیر ادارت اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر یونس اگاسکر کی ادارت میں سہ ماہی ''ترسیل'' قمر صدیقی اور عبید اعظم اعظمی کے زیر ادارت ''اردو چینل''، مظہر سلیم کا سہ ماہی ''تکمیل''، ظہیر انصاری کی ادارت میں ماہنامہ ''تحریر نو'' ضمیر کاظمی کی زیر ادارت ماہنامہ ''تریاق'' اردو فاونڈیشن کے زیر اہتمام سہ ماہی ''شناخت'' اور اشعر نجمی کی ادارت میں سے ماہی جریدہ ''اثبات'' میں ادب کی آدھی کائنات نظر آتی ہے یعنی فلسفہ، شعر شعور، موسیقی سبھی کچھ ہے۔ یہ رسالہ ادب اور زندگی کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان ہے۔ نیز شمیم طارق کی ادارت میں سہ ماہی ''نوائے ادب'' پچاس برسوں سے شائع ہو رہا ہے جس نے ادبی دنیا میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ۔ اس کے علاوہ ممبئی سے مشیر احمد انصاری کی ادارت میں میں ماہنامہ ''اردو آنگن'' نکلتا ہے۔ مارچ 2018 کا ظفر گورکھپوری پر خصوصی شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کے اعزازی مدیر حقانی القاسمی ہیں اور مدیر امتیاز گورکھپوری ہیں۔

مہاراشٹر شیر پور سے نکلنے والے سہ ماہی ''تزئین ادب'' کا شمار بھی ادبی رسائل میں اہمیت کا حامل ہے۔ ''تزئین ادب'' کے دامن میں دستک، آگہی، آئینہ، تحقیق وتدوین، تنقید وتجزیہ، روشنی، خصوصی مطالعہ، یادرفتگاں، گوشہ اور شعریات کے عناوین کے تحت حمد، نعت، غزلیں نظمیں، مقالے وغیرہ شائع کیئے جاتے ہیں۔ رسالہ نے اکتوبر، دسمبر 2015 میں ابن صفی نمبر نکال کر مقبول عام ادب کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں جو خدمت انجام دی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اورنگ آباد مہاراشٹر سے سہ ماہی ''حاشیہ'' کی 2017 میں اشاعت عمل میں آئی ہے جس کے مدیر اعزازی ڈاکٹر ہاجرہ بانو اور مجلس مشاورت میں ظفر اقبال، ناصر ناکاگاوا، وصی اللہ حسینی، پروفیسر عالم اور زہرہ عمران ہیں۔

پونہ سے 1980 میں ماہنامہ ''اسباق'' کی اشاعت عمل میں آئی 2005 میں اس رسالہ نے سلور جبلی نمبر اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ یہ رسالہ نذیر فتح پوری کی ادارت میں ادبی دنیا کے ذخائر میں اضافہ کررہا ہے۔

اردو کے ادبی رسائل میں مغربی بنگال اردو اکادمی سے نکلنے والا سہ ماہی جریدہ ''روح ادب'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ 1983 میں محمد نظام الدین کی نگرانی میں شائع ہوا۔ رسالہ سے متعدد خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے جن میں مغربی بنگال کا اردو صحافت نمبر، بنگال میں اردو شاعری نمبر، ابو الکلام آزاد نمبر، سجاد ظہیر نمبر، عین رشید نمبر وغیرہ کو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ جریدہ کو وقار و اعتبار بخشنے میں نائب مدیر مصطفے اکبر کی کاوشوں کا بہت دخل ہے۔ مغربی بنگال کا ترجمان پندرہ روزہ ''مغربی بنگال'' بھی اپنے ضخیم نمبروں کے سبب صحافتی دنیا کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ پندرہ روزہ ''مغربی بنگال'' کے ضخیم نمبروں میں امیر خسرو نمبر، ٹیگور نمبر، وحشت نمبر، اور فیض نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔

اکیسویں صدی میں مغربی بنگال سے نکلنے والے رسائل میں ماہنامہ ''انشاء'' نے صحافتی دنیا میں قابل قدر کارنامے انجام دئے ہیں۔ 1985 میں نکلنے والے اس رسالہ کا نئی نسل کے قلمکاروں کی تربیت میں اہم حصہ ہے۔ اس کے اب تک تقریبا 24 خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں کلکتہ کا عصری ادب

نمبر، ٹیگور نمبر، عالمی اردو افسانہ نمبر، گوپی چند نارنگ نمبر، گلزار نمبر، اسکنڈے نیویای نمبر، اور ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، گفتنی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''انشاء'' کے گفتنی نمبر کے متعلق ڈاکٹر عبدالحی کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے۔

''گفتنی نمبر میں گزشتہ 23 برسوں کے اداریوں کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ ان اداریوں میں نہایت اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اداریوں کو پڑھ کر کوئی بھی ادبی ذوق شوق رکھنے والا شخص ف۔س اعجاز کی قلمی و ادبی صلاحیت کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔''

(ڈاکٹر عبدالحیٔ، اکیسویں صدی میں اردو صحافت، مرتب ڈاکٹر امام اعظم، صفحہ 92)

کلکتہ سے ''رہروان ادب'' بھی نکلتا ہے جس میں مضامین، خاکے، افسانے، غزلیں، اعلی پایہ کی ہوتی ہیں۔ اس پر بہار رسالہ کی مدیرہ شہناز نبی ہیں جو رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال سے نعیم انیس نے بزم ادب کے تحت سالانہ رسالہ ''پرواز'' 2000 سے 2012 تک شائع کیا جس کے متعدد خصوصی گوشے بھی شائع ہوئے جن میں پروفیسر شہناز نبی، پروفیسر اعزاز افضل، منور انا، جاوید نہال، احسن مفتاحی، پروفیسر نصر غزالی وغیرہ کی ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی۔ نیز 2014 سے بزم افضل کے تحت سہ ماہی جریدہ ''فکر و تحریر'' شائع کر رہے ہیں۔ جس کے خصوصی گوشوں میں انیس رفیع، منور رانا، آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو نظم، مقصود انور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنوری تا مارچ 2018 کا خصوصی گوشہ ''عصر حاضر میں بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب'' اور ریسرچ اسکالر نمبر شائع ہوا ہے جو اپنے مشمولات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یقیناً نعیم انیس کی ادارت میں نکلے ہوئے یہ خصوصی شمارے اور گوشے ان کے اردو ادب سے بے لوث محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

کولکاتہ سے نکلنے والے سہ ماہی ''مژگاں'' کا بھی ادبی دنیا میں اہم مقام ہے۔ یہ رسالہ 1999 میں منظر عام پر آیا۔ ''مژگاں'' کا 25 واں سیمیں شمارہ جولائی تا دسمبر 2006 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ شموئیل احمد، ناصرہ شرما، اسلم جمشید پوری، اعزاز افضل، ظہیر انور، فیروز عابد، علقمہ شبلی، قیصر

شمیم، اقبال کرشن وغیرہ پر خصوصی گوشے شائع ہوئے نیز ادب اطفال نمبر، اردو ڈرامہ نمبر، بنگال کا اردو ادب نمبر نے کافی مقبولیت حاصل کی، 2015 میں ایک شمارہ ''جانے والوں کے نام'' سے شائع ہوا جس کی ضخامت 736 صفحات تھی۔ دراصل یہ شمارہ 2015.16 میں انتقال کرنے والے ایک سو سے زائد شعراء و ادباء کی خدمات پر مشتمل ہے۔ آزادی کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں میری نظر قاصر میں ضخیم ترین شمارہ 1775 صفحات پر محیط ''نئی نسل اور نیا ادب نمبر'' شائع ہوا۔ اس کے علاوہ 2018 میں ''بہار کا معاصر ادب نمبر جلد اول'' شائع ہوا ہے جس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

حیدرآباد سے نکلنے والے رسائل میں ماہنامہ ''سب رس'' کا ادبی دنیا میں منفرد مقام ہے۔ یہ رسالہ 1938 سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ میں دکنی ادب سے متعلق علمی ذخیرہ کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے خصوصی شمارے بیحد مقبول ہوئے جو حسب ذیل ہیں۔ قلی قطب شاہ نمبر، ادارہ نمبر، یوم زور نمبر، نجیب اشرف نمبر، ہاشمی نمبر وغیرہ، جنوری 2018 میں پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نمبر شائع ہوا ہے جو شائقین علم و ادب کے لئے خاصہ کی چیز ہیں۔ بیگ احساس کی ادارت میں رسالہ کا علمی و ادبی سفر جاری ہے۔ اسی شہر سے ماہنامہ ''شگوفہ'' بھی چالیس برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی کے مزاحیہ رسائل میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ شمارہ کے قلمکاروں کے عناوین مدیر کی ذہانت و فطانت کی غماز ہیں۔ علم و ادب کی اسی زمین سے ماہنامہ ''شاداب'' ڈاکٹر محبوب فرید کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ جس میں ادبی، تحقیقی، وتنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ طبی و سائنسی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجیز سے ''شیرازہ'' 1962 سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ میں نظمیں، غزلیں، افسانے اور مقالے شائع ہوتے ہیں۔ ''شیرازہ'' نے اب تک تقریباً پچاس نمبر شائع کئے ہیں جنھیں ادبی دنیا میں سراہا گیا۔ اسی ادارہ سے سالنامہ ''ھمارا ادب'' نکلتا ہے جس کا 2015.16 کا جموں و کشمیر معاصر نسائی ادب نمبر کافی مقبول ہوا کیونکہ ریاست جموں و کشمیر کا تانیثی ادب کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ اس نمبر کے ذریعے رسالہ نے خواتین قلمکاروں کو ریاست میں مناسب پلیٹ فارم مہیا کیا۔ ''سالنامہ ھمارا ادب'' کے لوک ادب نمبر، مشاہیر کشمیر نمبر، شیرازہ انتخاب نمبر، جموں کشمیر

نمبر،شخصیات نمبر،اولیاء نمبر،ڈوڈہ نمبر مولانا رومی نمبر،ہم عصر تھیٹر نمبر،فیض احمد فیض نمبر،سعادت حسن منٹو نمبر،تنقید نمبر،کرشن چندر نمبر نے بھی قبول عام حاصل کیا۔اس کے علاوہ شعبۂ اردو جموں یونیورسیٹی سے ششماہی مجلّہ ''تسلسل بھی شائع ہوتا ہے۔ریاست کشمیر سے نکلنے والے رسائل میں ایک اہم رسالہ ماہنامہ ''حکیم الامت'' ہے۔جو 2006 سے اب تک یعنی 12 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔یہ جریدہ2006 میں پروفیسر اکبر حیدری کی سر پرستی اور ادارت میں شائع ہوا تو اس کے پہلے شمارہ کے لئے صدر جمہوریہ ہند اے۔پی۔جی عبدالکلام نے خصوصی پیغام بھیجا،حکیم الامت کے اب تک بیشمار نمبر اور گوشے شائع ہو چکے ہیں ۔ادبی دنیا میں رسالہ کے میر تقی میر نمبر(اگست 2010) کشمیر نمبر (جنوری2011) جوش نمبر(اکتوبر 2011)اکبر حیدری نمبر (اکتوبر2012)مقالات اکبر حیدری نمبر(ستمبر 2013) اشفاق نمبر (اپریل 2013) اقبالیات اور زمانہ کانپور نمبر(ستمبر 2014) گلشن خطائی نمبر(فروری2016) معرکہ اسرار خودی نمبر(اکتوبر 2o17)وغیرہ نے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اقبال فہمی کے حوالے سے اس رسالہ کو اختصاص حاصل ہے۔ 2012 میں چیف ایڈیٹر ڈاکٹر اکبر حیدری رحلت کے بعد ڈاکٹر محمد ظفر حیدری نے رسالہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں ہنوز انھیں کی ادارت میں رسالہ کا سفر جاری ہے۔

کرناٹک اردو اکادمی بنگلور سے ماہنامہ ''ادیب'' اکتوبر 2011 سے شائع ہوا۔جس کے مدیر اعلی حافظ کرناٹکی اور مدیر ایس مرزا عظمت اللہ ہیں۔نومبر 2013 میں ابن صفی نمبر کی اشاعت عمل میں آئی لیکن افسوس کہ 2013 کے اواخر میں رسالہ بند ہو گیا۔بنگلور سے 2005 میں عظیم الدین عظیم کی ادارت میں دو ماہی ''ظرافت'' کا بھی اجراء ہوا جس میں ظرافت سے متعلق مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے۔

پنج دریاؤں کی زمین پنجاب سے بیسویں صدی اکیسویں صدی تک ادبی صحافت کا سفر کرنے والے جرائد میں محکمہ السنہ پنجاب پٹیالہ سے ''پرواز ادب'' کا نام اہم ہے۔یہ رسالہ 1979 میں نکلنا شروع ہوا۔اب تک تیس سے زائد خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں۔مالیر کوٹلہ سے مجلّہ انسٹی ٹیوٹ میگزین نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان اردو پرشین انڈ عربک پنجابی یونیورسیٹی سے ہر سال شائع

ہوتا ہے ،اس مجلّہ سے اب تک جدید شعراء مالیر کوٹلہ ،قدیم شعراء مالیر کوٹلہ ،پنجاب میں اردو ادب اور ہندوستانی فارسی ادب وغیرہ نمبرات شائع ہو چکے ہیں ۔اس کے علاوہ ہریانہ سے سہ ماہی مجلّہ ''جمنا تٹ'' شائع ہوتا ہے،جس کا پہلا شمارہ 1986 میں شائع ہوا۔ہماچل پردیش سے کرشن کمار طور کی ادارت میں ''سرسبز'' اور شباب للت ''فکروفن'' کو نکالتے تھے۔

تمل ناڈو سے علیم صبا نویدی کی ادارت میں ماہنامہ ''نورجنوب'' کا اجراء ہوا بعد میں یہ ماہنامہ سہ ماہی ہوگیا۔اکیسویں صدی میں شمالی آرکاٹ وانم باڑی سے ماہنامہ ''نشان منزل'' نیز 2011 میں حکیم یعقوب اسلم کی ادارت میں ''چراغ اردو'' اور 2013 میں ماہنامہ ''فروغ ادب'' کا اجراء عمل میں آیا جس نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں حصہ لیا۔اس کے علاوہ کیرالہ سے کے پی شمس الدین کی ادارت میں کیرالہ اردو ٹیچر ایسوسیشن کے ترجمان سہ ماہی ''اردو بلیٹن'' کا اجراء 1984 میں ہوا جس نے زبان و ادب کی خدمت کی۔

اکیسویں صدی کے نمائندہ رسائل میں قابل ذکر رسالہ ''تحریک ادب'' بھی ہے۔اس کا پہلا شمارہ 2008 میں شائع ہوا۔اب تک اس رسالے کے چار خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ادبی دنیا کو پہلے کارگل کے شاعر مانچو اسفندیار خاں سے متعارف کرانے کا سہرا اسی جریدہ کے سر جاتا ہے۔اس کے علاوہ کشمیر کے نمائندہ لوگوں پر رسالہ نے گوشے بھی شائع کئے ہیں۔جن میں میر غلام رسول علی کشمیری کا نام نمایاں ہے۔نیز احمد رشید ،شمس کمال انجم ،میکش امروہوی،غضنفر علی خاں ،ڈاکٹر بلند اقبال کی خدمات اور کارناموں سے واقف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔رسالہ کا پانچواں گوشہ پروفیسر صغیر افراہیم پر جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔

2007 میں شاہد علی خاں کی ادارت میں سہ ماہی ''نئی کتاب'' کا اجراء ہوا جس میں نئے قلمکاروں کو بھی جگہ ملتی ہے۔

راجستھان اردو اکیڈمی سے ''نخلستان'' شائع ہوتا ہے۔

ان رسائل کے علاوہ اکیسویں صدی کے اہم رسائل میں ماہنامہ کتاب نما (1960) سہ ماہی

ذہن جدید(1990))سوغات بنگلور(1959) کتاب لکھنؤ(1962) گفتگو(1967) شعر وحکمت (1970) عصری ادب (1970) عصری آگہی (1978) فن وشخصیت( 1975) جواز ما لیگاؤں(1977)، سہ ماہی معیار(1977)، سہ ماہی تناظر(1977)، نقد ونظر(1979) عالمی اردو ادب(1985) وغیرہ نے علمی اور ادبی دنیا میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ادبی رسائل کے تذکرہ میں ممکن ہے کہ بعض رسائل کا ذکر رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ مختصر مقالے میں اکیسویں صدی کے تمام رسائل پر گفتگو کرنا ممکن نہیں اس لئے کہ

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اردو رسائل کا یہ منظر نامہ ادب کے مختلف پہلوؤں، موضوعات، مسائل، امکانات جدید تقاضوں اور نئے رجحانات کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ جرائد کی بھیڑ میں بعض ادبی رسائل ایسے بھی ہیں جو نام ونمود اور مالی منفعت وغیرہ کی غرض سے نکل رہے ہیں ایسے رسائل کو سنجیدگی سے اردو زبان وادب کی خدمت کی جانب متوجہ ہونا چاہئے۔ بعض خامیوں کوتاہیوں کے باوجود اکیسویں صدی کے یہ رسائل اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو زبان اب بھی زندہ ہے۔ مختصر یہ کہ ادبی رسائل نے اس صدی میں بھی اب تک جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ کم نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اردو رسائل کی یہ خدمات عاشقان اردو کے لئے سرمایۂ افتخار بھی ہیں اور سرمایۂ اعتبار بھی۔

# غالب کے اردو قصائد۔ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر محمد عالمگیر حسین☆

قصیدہ اردو شاعری میں اہم صنف سخن ہے، یہ قصد لفظ سے ماخوذ ہے۔جس کا لغوی معنی تعریف وتوصیف کرنا۔عام طور پر جب کسی شخص یا شئی کی تعریف ہوتی ہے اصطلاح میں وہی شئی قصیدہ ہے۔

مرزا غالب اردو شاعری کی دنیا میں ایک روشن ستارہ تھے۔اگر چہ غالب نے غزل گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ شہرت حاصل کی لیکن دوسری اصناف سخن میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔قصیدہ گوئی کے لیے جس اندازی کی مدح گوئی ضروت تھی اس کی طرف ان کا دل مائل نہ تھا۔مگر اس صنف کو اپنانا پڑا ضرورتا یعنی کار برآوری کے لئے ،حصول منفعت کے لئے اور اپنی بے حساب ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قصیدہ نگار ہونے کا رتبہ حاصل ہوا۔اسی لئے اس باب میں غالب کی قصیدہ نگاری کا بطور خاص جائزہ لیا گیا ہے۔

ابتدائے شعر گوئی سے لے کر عمر کے آخری حصے تک غالب نے بہت سے قصیدے کہے۔اردو میں کم فارسی میں زیادہ۔ان کے علاوہ چند مدحیہ قطعات بھی کہے۔یہاں ان کی قصیدہ نگاری کا جائزہ صرف اردو قصائد کا لیا جائے گا جن کی تعداد چار ہے۔ان میں سے دو قصیدے۔

ساز یک ذرہ میں فیض چمن سے بیکار
دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ا

منقبت میں ہیں اور باقی دو

ہاں مہ نو سین ہم اس کا نام
صبح دم دروازہ خاور کھلا۔۲

---

☆پی ایچ ڈی محقق، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی،ڈھاکہ

مرزا غالب بہادر شاہ ظفر کی مدح میں فرماتے ہیں۔

ہاں مہ نو سین ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غالب؟ بندہ — عاجز ہے گردش ایام !
اڑ کے جانا کہاں کہ تاروں کا — آسمان نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرور خاص خواص! — حبذا اے نشاط عام و عوام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام ۳

قصیدہ میں تشبیب کی حیثیت تمہید کی ہوتی ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کی توجہ کو فورا گرفت میں لے لی جائے۔ قصیدہ نگار کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ پہلے ہی شعر سے سننے والوں کو مرعوب و متاثر کر لے۔ اس لئے تشبیب پر وہ خاص طور پر توجہ دیتا ہے۔

غالب کو اپنی تشبیب پر بہت فخر تھا۔ ایک اردو خط میں غالب ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دوں۔ میرے قصیدے کو دیکھ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ ۴

''وہ اور کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی، انوری پہنچتے ہیں۔ افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔ ۵

غالب کی اس رائے سے حالی بھی اتفاق کرتے ہیں۔ ان خیال ہے کہ:

''مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی مرتبہ ہوتی ہے۔ اور اسی سے قصیدے کے بلندی و پستی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مشرق شاعری میں عموما اور ایران کی شاعری میں خصوصا کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹا، ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ہوتا۔ علی الخصوص متاخرین نے مبالغے کی لئے بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ہجو کے درجے تک پہنچا دیا

ہے۔اور اس سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں۔البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔جس طرح قدما کے قصائد میں وہ نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اس سے معری ہیں۔لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں۔''۶

ہاں مہ نو سین ہم اس کا نام

اس شعر کی تشبیب نہایت دلکش اور پر اثر ہے۔جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔کہ ہلال عید کی خمیدہ شکل دیکھ کر شاعر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اے پہلی تاریخ چاند تیری کمر کیوں خم ہے؟تو کسے جھک کے سلام کر رہا ہے ؟جواب نہیں ملتا تو شاعر کہتا ہے کہ تو اس کا نام نہیں جانتا۔تو لے میں بتاتا ہوں:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشاہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذو الجلال و الاکرام۔ ۷

غالب کے اردو قصیدوں میں اس قصیدے کی تشبیب سب سے زیادہ پر کشش اور جاندار ہے۔کلیم الدین احمد غالب کے اس قصیدے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

یہاں غالب نے بالکل نیا راستہ نکالا ہے۔قصیدے کے رسمی محاسن کا نام یہاں نام ونشاں نہیں۔زبان میں سلامت روانی، متانت ہے لیکن وہ شان وشوکت نہیں۔وہ طمطراز نہیں، جسے قصیدے کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔مثلاً سودا کے ایک قصیدہ کی تشبیب اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا باغ خزاں مستاصل ۔ ۸

قصیدہ کا اصل مقصد ہے کسی کی تعریف وتوصیف بیان کرنا۔یہیں قادر الکلام شاعر زور کلام کرتا ہے۔یہاں وہ جس قدر زیادہ مبالغے سے کام لیتا ہے اتنا ہی کامیاب قرار پاتا ہے۔حالی نے بے جا مبالغہ آرائی کو قصیدے کا عیب بتایا ہے۔اور اسی عیب سے داغدار ہونے کے سبب وہ اردو قصائد کے ناپاک دفتر سے بدتر

ٹھراتے ہیں۔

لیکن اصلیت یہ ہے کہ مبالغے کے بغیر کوئی شاعر مدح کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے۔ اردو ادب میں سوداؔ اور ذوقؔ کے قصیدے اسی مبالغہ آرائی کا کمال ہیں۔ غالب حد سے بڑھی ہوئی مدح کو ''بھٹی'' بتاتے ہیں اور اسے اپنے مرتبے کے منافی قرار دیتے ہیں۔۹

خطوط غالب مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو اکثر سخت مالی دشواریوں کا سامنا رہا۔ حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے بار بار اہل ثروت کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ سیکڑوں کی جھوٹی خوشامد کی اور قصیدہ گوئی کرنا پڑی ۔ بہت سے خطوط میں خود کو فقیر اور خیرات خوار لکھا۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہے۔

''اس قصیدے سے مجھ عرض و سگاہ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔''

> ''آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کی پاس سو روپئے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رامپور سے پہنچے ہیں۔ فقیر کو بھی یہ توقع ٹھری کہ میرا مردہ بے گور کفن نہ رہے گا۔''
>
> '' آخر عمر میں تین التماس آپ سے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہزار بارہ سو روپے قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری التماس یہ ہے کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے۔''
>
> ''فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا۔''

غالب کی سب خوشامد اور گداگری کا سبب تندرستی اور تنگدستی کے ساتھ یہ خواہش تھی کہ شاہانہ زندگی بسر کریں ۔ شہر میں جو عزت ہے وہ برقرار ہے۔ اور دربار میں جو 'لبر' وہ قائم رہے۔ اس لئے جگہ جگہ ہاتھ پھیلایا اور جھوٹی مدح سرائی کی۔

غالب در مدح ڈلی کہتے ہیں۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکتی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ، اس سے کیا لکھے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ، اسے کیا کہے۔
خاتمِ دوستِ سلیمان کے مشابہ لکھے
سر پستان پر یزاد سے مانا کہیے۔ ۱۱

درمدح شاہ غالب فرماتے ہیں:

اے شاہ جہاں گیر جہاں بخش جہاندار!
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
آصف کو سلیمان کی وزرات سے شرف تھا
ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزرات
تجھ کو شرف مہر جہا ں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت۔ ۱۲

قصیدے کا اختتام دعا پر ہوتا ہے یہ دعا برمحل، مختصر اور پر اثر ہونی چاہئے۔غالب یہاں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔دعا کا نمونہ یہ ہے:

ہے ازل سے روائی آغاز
ہوا ابد تک رسائی انجام
تم سلامت رہو ہزار بار
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔ ۱۳

اردو شاعری میں یہ بات عام ہے کہ غالبؔ ایک مشکل گو شاعر ہے۔مشکل گو شاعر بیدل سے متاثر ہونے کی وجہ سے غالب کی پہلے دور میں کہتے ہوئے قصیدہ پیچیدگی اور مشکل بیانی کا شکار ہے۔ محمد حسین آزاد

نے' آب حیات' میں اسی طرح کے کلام پر طنز کیا تھا کہ ''کسی نے سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا'' ۱۴
لیکن آخر اس خامی کا اعتراف کیا۔ اپنے پرانے کلام کو رد کیا اور ابہام و پیچیدگی سے اجتناب کرنے لگے۔
لیکن قصیدے کی معاملے میں وہ کچھ دنوں پرانی روش پر چلتے رہے۔ کیونکہ اس میدان میں ان کا براہ راست
مقابلہ ذوق سے تھا۔ ذوق کی وفات کی بعد بادشاہ نے اپنے کلام کی اصلاح پر غالب کو مامور کیا۔ بہادر شاہ
کی مدح میں کہے گئے قصائد اسی دور میں تحریر ہوئے۔ ان قصائد میں وہ اپنی قدیم مشکل گوئی سے اجتناب
کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ پیچیدہ انداز بیان، نہ مغلق تراکیب، نہ ایسی تشبیہیں جن تک رسائی دشوار ہوا۔
اس لئے ان کے یہ دونوں قصیدے دل میں گھر کرتے نظر آتے ہیں۔
پامال راستوں پر چلنا غالب کو گوارا نہ تھا۔ ہر میدان میں وہ اپنا راستہ آپ نکالتے تھے۔ قصیدہ نگاری میں بھی
وہ اپنی طرز خاص کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی تشبیب دل آویز، گریز اور پرکشش ہوتی ہے۔
مدح گوئی میں وہ زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے یا ملا سکتے نہیں لیکن ان کے مدح کسی حد تک حقیقت کے
قریب اور اسلیے زیادہ پر اثر ہوتی ہے اور ان کے قصائد دعائیہ حصہ تو آج تک زبان زد خلائق ہیں۔

## حوالہ جات :


۱۔ مرزا غالب، دیوان غالب مطبع سید الاخبار، دہلی، اکتوبر، ۱۸۴۱، صفحہ: ۱۸۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۳۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔۱۹۱

۴۔ ایضاً، ص ۴۴

۵۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب۔ اردو اکیڈمی، طبع لاہور، اکتوبر ۱۹۶۲ء، صفحہ ۷۱

۶۔ ایضاً، ص ۹۳

۷۔ایضاً،ص ۱۹۴

۸۔نورالحسن نقوی، غالب شاعر اور مکتوب نگار، ایجوکیشنل بوک ہاؤس علی گڑھ، طبع: ۲۰۰۰ء۔صفحہ ۱۰۷

۹۔ایضاً،ص ۱۰۹

۱۰۔مجنوں گورکھپوری، غالب شخص اور شاعر، ایجوکیشنل بوک ہاؤس علی گڑھ، طبع: ۱۹۸۳ء۔صفحہ ۳۲

۱۱۔مرزا غالب، دیوان غالب، مطبع سید الاخبار، دہلی، اکتوبر، ۱۸۴۱ء، صفحہ ۲۰۲

۱۲۔ ایضاً،ص ۲۰۷

۱۳۔ ایضاً،ص ۲۰۹

۱۴۔ایضاً،ص ۱۱۳

# حسرت موہانی کی شاعری میں سیاسی افکار

غلام مولی ☆

[ Abstract: Hasrat Mohani was an Indian eminent Urdu poet who demanded first time to escape the Indians from the British colonialism. Perhaps he took the initiatives to raise the voice with all the mass people to accomplish their rights against British Rules. He has taken some steps for the Independence of sub-continent with all those people who were still in a deep sleeps as well. Hasrat Mohani took places in the Indian political history had referred himself as an activist in the Indian Independence Movement in 1921 at the Ahmedabad session of the Indian National congress. His political poetry is well known to all who believed on freedom from the slavery. Mohani played a significant role to inspired them to establish their rights through his political poetry.In this regard some ideological thoughts of Hasrat Mohani's poetry can be explained in the given below topic.]

حسرت موہانی اردو اشعار کی دنیا میں ایک عزیز ترین نام ہیں۔ جنہوں نے اپنی اشعار کے ذریعے ہندوستان کے عوام کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی ہیں۔ وہ اپنی نظم میں ہر جگہ سیاسی نظریہ اظہار کرنے کے قائل تھے۔ وہ ایسے ایک انفرادی شخصیت کے مالک تھے جن کے تمام خیالوں میں عوام کی زندگی کو اور بہترین

☆ اسسٹنٹ پروفیسر ، شعبۂ اردو ، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

طبقے پر پہچانے کی دھن تھی۔ موہانی اپنی کاوشوں سے اردو سیاسی نظموں کو اتنا وقار بخشا جو آج تک ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے برصغیر کی عوام کو اپنی حقوق کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے قدم اٹھایا۔ جبکہ یہاں کے باشندوں اپنی ذمہ داری کے بارے میں ناواقف تھے حسرت نے انہیں غفلت کی نیند سے جگا کر ایک صحیح راستہ اختیار کرنے کا حوصلہ دیا۔ انکی اشعار میں ایسی ایک انفرادی خوبی ہے جو اور کسی کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلماں رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت ہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزاد ہو کر [1]

حسرت کے ہر شعری مجموعہ میں آزادی کے نغمے کا رنگ پھیلا ہوا ہے۔ وہ خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو ناکامی سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ غیر ملکیوں کے نفرت سے بچا کر ایک سچی زندگی بسر کرنے کے لئے یہاں کے مسلمانوں کو وہ خواب دیکھانا چاہتے تھے۔ انگریز اس ملک میں تاجر کی حیثیت سے داخلہ ہوئے۔ بعد ازاں یہاں کے باشندوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، حسرت نے ان کے خلاف قلم اٹھایا اور آواز بلند کی ہے۔ دراصل انگریز یہاں حکومت قائم کرنے کے بعد ان کے دوران حکومت میں مسلمان کو

اپنی حقوق کے حصے سے محروم کر دیئے گئے۔ جس کی خاطر حسرت کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ انگریز کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے میں مصروف تھے۔ حسرت کہتے ہیں:

ہے غضب ہنگامۂ فصل بہار اب کی برس
دل پہ کا ہے کو رہے گا اختیار اب کی برس
ہے جنون شوق ابھی سے بیقرار اب کی برس
کیا غضب ڈھائے گا طوفان بہار لب کی برس
کامیابی جلد ہوگی آکے پابوس امید
کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار اب کی برس
حادثے سنہ آٹھ میں گذرے بہت اب دیکھئے
کیا دکھائے گردش لیل و نہار اب کی برس [۲]

حسرت کی نظموں کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہیں کہ وہ ہر جگہ آزادی کا رنگ چڑھانا چاہتے ہیں۔ برصغیر میں انگریزوں کے علاوہ اور بہت سارے اجنبی حکمرانوں نے تجارات کے ذریعے حکومت اختیار کر لی۔ جن کے بارے میں مشہور ماہرین معاشرت ایڈام اسمیت (Adam Smith) کا قول ملاحظہ ہوں:

"Since the 1st centuries AD. by the European economic influences extended over the region namely Portuguese, Dutch, French and British. British political rules began at 16th centuries. Traders when the last Empower of Bengal was defeated Palashy. (۳)

ایڈام اسمیت (Adam Smith) کے اس قول سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انگریز یہاں تجارات کی خاطر داخل ہونے کے بعد اپنا ظالمانہ شکل اختیار کیا۔ وہ یہاں کے عوام کو بیوقوف بنا کر ان کی حکومت کو ہٹانے

کی مکاری چال میں مصروف ہو گئے۔ برصغیر کے سادہ سیدہ دل والے لوگوں کو دھوکا دے کر وہ اپنی حکومت کی جڑیں کی پھیلاتے رہے۔ جس کا ہر لمحہ حسرت نے اپنی نظم میں روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

قبضۂ یثرب کا سوداد شمنوں کے سر میں ہے
اب تو انصاف اس ستم کا دست پیغمبر میں ہے
جو یورپ ہے بنا بیدارئی اسلا م کی
خیر ہے در اصل یہ با آنکھ شکل شر میں ہے
خاطر افسردہ میں باقی ہے اب تک یاد عشق
گرمی آتش ہنوز اس مشت خاکستر میں ہے [۴]

مذکورہ اشعار میں حسرت کا کہنا یہ ہے کپ آج مدینہ کے سوداد شمنوں کے قبضے میں ہیں۔ یہاں دشمنوں سے مراد غیر مسلمانوں ہیں۔ انکے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ساری دنیا میں غیر مسلمانوں نے مسلمانوں پر ناجائز طریقیوں سے ظلم وستم جاری رکھے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے مسلمانوں کی زندگی میں تباہی لانا چاہتے ہیں ۔ یہ حالات صرف برصغیر ہیں میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں بھی ایک جیسے ہیں۔ ان کے ظلم وستم سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔ چاہئے وہ بڑھا ہو بچہ، مرد ہو یا عورت۔ کئی وضوحات کے ذریعے وہ مسلمانوں کے جائے اجداد کو مٹی کے ساتھ مٹا دینے کے خواہش مند ہیں۔ موجودہ دو میں وہ کشمیر سے لے کر شام، عراق، افغانستان، لیبیا، یمن، وغیرہ ملکوں کو مٹی کے ساتھ مٹایا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ کر کے وہ ساری دنیا کے مسلمان قوم کو اپنی مذہبی کشمکش کے ذریعے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ حسرت نے دنیا کی تمام مسلمانوں کو اس سازش کے خلاف ایک متفق سمجھداری سے آواز بلند کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کو گزرے ہوئے زمانہ کی طرف یاد دلاتے ہیں۔ حسرت کہتے ہیں:

قلت افواج ٹرکی پر نہ ہو اٹلی دلیر

ایک ہے سو کے لئے کافی جو اس لشکر میں ہے۔
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند
رایت حریت وحق، جو کف انور میں ہے۔(۵)

حسرت بڑی دور اندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے گزرے ہوئے زمانے کی طرف اشارے کرتے ہیں۔وہ ترکی فوج کے سپاہی کو ساری دنیا پر قابو پانے والا ایک ہمت وار نوجوان کے طرح دیکھانا چاہتے تھے۔انکی نظر میں خالد بن والید ایسے ایک ہنر مند راہ بار ہیں جنہوں نے اپنی حکیمانہ انداز سے دنیا پر قابو حاصل کیا تھا۔انکے اخلاق،ظریفانہ انداز اور سیاسی تصورات عام لوگوں پر کافی اثرات چھوڑے۔ترکی اور ایک مشہور لیڈر انور پاشے بھی وہ گہری مشابہت رکھتے تھے۔غرض یہ کہ حسرت کہنا چاہتے ہیں کہ سیاست ایسی ہونی چاہئے کہ جس کے ذریعے ہم لوگوں کی زندگی کو فروغ دے سکتے ہیں۔یہ ایک عبادت کی طرح ہے جو اپنی ہستی کو مٹا کر دوسروں کے لئے قربان کرے۔عوام کے خوشی اور غم کے ساتھ چلنا ہی اصل سیاست کا دامان ہے۔بہر حال ہمارے سوسائٹی میں یہ اندازہ بالکل الگ ہیں۔اکثر سیاست دان نے ہمیں احمق سمجھتے ہیں ۔وہ عوام کے ہستی کی عزت نہیں کرتے۔یہاں حسرت اس قسم کے لوگوں کو تلقین دینا چاہتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

دل کی جو ترک عشق سے حالت بدل گئی
وہ بے خودی و حزمئی بے خلل گئی
تجھ کو فلک نے مجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا
کیا تیری یاد بھی مرے دل سے نکل گئی ۔
آہ اس سے نارساہی جو رہتی تو خوب تھا
کیوں اس حریم عیش میں یوں بے محل گئی
سودا ہی وہ نہیں جو سر سے چلا گیا
حسرت ہی وہ نہیں ہے جو دل سے نکل گئی۔(۶)

حسرت موہانی عمدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ آئے تو یہاں شعر و ادب کے علاوہ انہوں نے سیاست کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ علی گڑھ سوسائٹی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اہم رول ادا کرنے لگے۔ وہ سیاست کے ذریعے لوگوں کے تقدیر کو بدلنے کے قائل تھے۔ اس لئے یونیورسٹی انتظامیہ ان پر ناخوش تھی اور وہ یونیورسٹی سے بابار معتوب کئے گئے۔ وہ دہلی کے مشہور استاد نسیم دہلوی کے پیروی کرتے تھے۔ نسیم دہلوی دراصل مومنؔ کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں:

حسرت تری شگفتہ کلامی یہ آفریں
یاس آگئیں نسیم کی رنگیں بیانیاں
حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا۔ (۷)

انہوں نے ساری زندگی بڑے اہتمام سے شعر گوئی کی ہے۔ ''نکات سخن'' انکا اہم کارنامہ ہے۔ انکی طبیعت میں صاف گوئی ہمیشہ موجود تھی۔ اس لئے خلافت کانفرنس ہو یا کانگرس ہو کوئی بھی انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی طرح دنیا چاہتے تھے۔ اور سچ کے راستے پر چلنے کے قائل تھے۔ تکمیل آزادی کا زیر لیشن (Regulation) لوگوں کے سامنے حاضر کرنے والا یہی مرد مجاہد تھا۔

شاعری کے علاوہ انکو سیاست میں بڑا شوق تھا۔ خاص طور اشتراکی خیالات پر انہوں نے بہت غور کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت عوام کو گہری پریشان سے لڑتے ہوئے دیکھا۔ اس زمانے میں وہ کانپور میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

حسن بے پردہ نے نقاب نہیں
کیا حجاب نظر حجاب نہیں۔
وقف بل من مزید ہے اب شوق
ستم یار بے حساب نہیں

اور ہے کیا ؟ جو بزم ساقی میں
مے کشوں کے لئے شراب نہیں
فتنہ روز حشر ہے بیدار
شب میں وہ محو خواب نہیں
جان حسرت یہ قہر ہے غم ہجر
جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں (۸)

۱۹۴۵ء کی عالمی جنگ انہیں بہت صدمہ پہنچایا۔ وہ غور سے مطالعہ کیا کہ کسی طرح انسان ایک دوسرے کے خلاف دشمنی کرتا ہے؟ وہ معاشی فتاح حاصل کرنے کے لئے ایک ملک کا حکمران دوسرے ملک کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن عوام اس کشمکش کے خلاف اپنی واز بلند کرنے کا ہمت نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ صرف سماج کے حالات کو دیکھ کر آفسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کہتے ہیں:

معیشت میں بہر سو رنگ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوت ہے جہاں میں ، سویت ہے جہاں میں ہوں
مقام فرد بھی محفوظ ہے فوز ِ جماعت میں !
نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہے جہاں میں ہوں
اصول اشتراک ، آئین بیت المال سے مشتق
اساس کار جمع و خرچ ملت ہے جہاں میں ہوں
فلاحت ہو کہ حرفت، کامیابی سعی انساں کی
نظام اجتماعی کی بدولت ہے جہاں میں ہوں (۹)

حسرت نے نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ مگر وہ غزل کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ جب انہوں نے شعر و شاعری کا چرچا شروع کیا تو اردو غزل کے بارے میں بہت سارے بدگمانیاں سامنے آگئیں۔ حسرت نے مختلف

اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن آخر تک غزل کو اپنایا۔ بچپن میں عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور میں حسرت نے شعروادب کا اچھا معالعہ کیا اور بہت چھوٹی عمر سے شعر کہنے لگے۔ فن شعر کے رموز ونکات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے نسیم دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ انہی سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ کہتے ہیں:

لکھتا ہے مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں (۱۰)

کلام حسرت میں مومنؔ کی غزل کی طرح عشق کی ساری کیفیتیں اور حسن کی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ وہ سیاسی شعر گوئی کے علاوہ فلسفہ، فکر، پیغام جیسی چیزیں ان کے دماغ سے کوئی مناسبت نہں رکھتے تھیں۔ انفرادی طور پر اپنی شاعری کے لئے ایک جاندار پہلو کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ ہے عشق! اسے وہ اپنی خاص ٹکنیو سے پیش کرتے ہیں۔ انکے کلام میں حسن پرستی صرف کسی حسین چہرے تک محدود نہیں، بلکہ خوبصورت لفظوں کی لہر دلکش ترکیبوں اور مترنم بحروں کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں اپنے اشعار میں سمو لیتے ہیں۔ وہ اس کی تمام کیفیتوں کا مزہ لے کر بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

وصل کے شوق کا خود وصل سے اطفا نہ کرے
عشق صادق جو ہو مخلص بھی کو ایسا نہ کرے
اس پہ افسوس جو بینائے محبت ہو کر
جلوۂ دوست کا ہر شے میں تماشا نہ کرے
تاب دیدار نہ ہو جس کو خود اس کا ہے قصور
عشق اس حسن نظر سوز کا شکوا نہ کرے
التفات ستم خاص ہے کافی حسرت
حسن سے عشق توجہ کا تقاضا نہ کرے ۔ (۱۱)

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم محسوس کرتے ہیں۔ حسرت کے زمانے میں سیاست کے علاوہ عشق کی

جزئیات نے زبردست ترقی کی ہے اور زندگی کے ہر شعبے پر اس کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئی ہے۔ یہاں اس کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے وہ نظر ملانے لگی ہے۔ کہتے ہیں:

آپ نے قدر کچھ نہ کی دل کی
اڑ گئی سفت میں ہنسی دل کی
یاد بر حال میں رہے وہ مجھے
الغرض بات رہ گئی دل کی
مل سکی ہم کو ان سے داد و فا
جو نہیں جانتے لگی دل کی
ان سے کچھ تو ملا۔ وہ غم ہی نہیں
آبرو کچھ تو رہ گئی دل کی
مر مٹے ہم نہ ہو سکی پوری
آرزو تم سے ایک بھی دل کی
وہ جو بگڑے رقیب سے حسرت
اور بھی بات بن گئی دل کی۔ (۱۲)

حسرت نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کا مطالعہ بھی کیا ہے جس سے ان کی نظم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے کلام میں بے شک فکر و فلسفہ موجود نہیں مگر ان کے یہاں ایک طرح تازگی ہے۔ پامال مضامین سے وہ دامان بچاتے ہیں اور بیش قیمت شعری تجربات دلکش انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ حسرت کو سیاسی نظم پر گہرا عبور حاصل تھا اور اس کی خدمت کے لئے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا۔ اردو کے ادبی رسالوں کی انہوں نے خاص طور پر خدمت کی۔ نکات سخن لکھ کر اردو ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ پابندی کے ساتھ رسالے نکالنے میں بھی مشغول تھے۔

حسرت کا معالعہ وسیع تھا۔ اردو زبان کے علاوہ وہ فارسی شعراء کے کلام کا انہوں نے تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کے کلام میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے مگر ان کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے۔ وہ حسن پرست بھی ہیں اور عاشق مزاج بھی۔ (۱۳)

حسرت کہتے ہیں:

لب یار شکر فشاں ہو رہا ہے
شکار دل و ستاں ہو رہا ہے
بہت آج وہ مہربان ہو رہے ہیں
مرے ضبط کا امتحان ہو رہا ہے
حسینوں پہ جانیں خدا ہو رہی ہیں
وفا وعدۂ عاشقاں ہو رہا ہے
میں اب کیا کہوں تجھ سے بات اپنے دل کی
کہ تو بے کہے بدگماں ہو رہا ہے
جسے درد جاتا تھا ہم نے وہ حسرت
محبت میں درمانِ جاں ہو رہا ہے۔ (۱۴)

حسرت موہانی کے ہم عصر ہمارے قومی شاعر قاضی نذر الاسلام نے بھی اپنی شاعری میں ظلم اور ستم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بنگلا شاعری کی روایتی اسلوب سے بھی بغاوت کی۔ انہوں نے اپنی جودت فکر اور آتش بیانی سے ظلم واستبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور انسانی ہمدردی کا راگ اپنایا ہے۔

گو ادبی دنیا انہیں زیادہ تر ایک باغی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن وہ بیسویں صدی کے ایک شاعر فطرت ہیں۔ قاضی نذر الاسلام نے بھی حسرت موہانی کی طرح اپنے اشعار میں سیاسی تخیل اختیار کیا۔ انکی شاعری کو نوائے وقت کہا جا سکتا ہے۔ ان کا دور سماجی، سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا پر آشوب زمانہ

تھا۔ دراصل انکا کہنا یہ تھا کہ شاعری سے صرف حسن پرستی اور دماغی عیاشی کرنا مناسب نہیں۔ بلکہ قوم کو غلامی کی زنجیر سے بچا کر آزادی حاصل کرنے کے لئے ادب و شاعری سے مفید تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (۱۵)

انکے مشہور نظم باغی میں لوگوں کو نئی امید دلانے کے لئے حوصلہ افزائی۔ وہ کہتے ہیں:

کہہ دے اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں
اتنا بلند، اتنا بلند کہ ہمالیہ چوٹی بھی میرے آگے سر نگو ہے
کہہ دے! اے بہادر کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سورج
اور ستاروں کو توڑ کر، جنت و دوزخ کو دہلا کر اور عرش سے ٹکرا کر۔
میں اس دنیا کے لئے مجسمہ حیرت بن گیا ہوں۔
کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ مرا سر ہمیشہ بلند رہے
میں سرکش! سنگ دل اور آتش زباں ہوں۔
میں قیامت کا ندیم ہوں، طوفان ہوں، تباہی ہوں، دہشت ہوں۔
میں دنیا کے سراپا ہلاکت ہوں ۔۱۶

حسرت موہانی ذات پات کی تنگ نظریوں سے بالاتر تھے ان کے دل میں آدمیت کا بڑا احترام تھا۔ وہ حب انسانیت کے علمبردار تھے۔ وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کو آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ وہ دونوں قوموں کے تہذیب و تمدن کی ترجمانی کرتے تھے۔ حسرت ایک ایسے دنیا کو تخلیق کرنا چاہتے تھے جہاں انسان کا کوئی دشمن نہ ہو، وہ ایک دوسرے کا معاون ہو۔

حسرت موہانی کے ہم خیال مولانا محمد علی جوہر بھی ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ جوں نے اپنی قوم و ملت کے بہبودی کے لئے تمام تر قربانیاں کیں۔ برطانوی حکومت کے خلاف تحریک آزادی کے نامور اور ممتاز رہنما زمحمد ولی جوہر اپنی آواز بلند کی۔ اپنی قوم کے لئے بیحد محبت کی خاطر انہوں نے سیاسی زندگی اختیار

کیا۔ ترک ملازمت کے بعد وجوہر کی بقیہ زندگی سیاست میں مشغول رہ گئی۔ اس وقت انہوں نے جو کچھ کیا وہ سیاسی مقصد کو پیش نظر کیا۔ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ اس زمانے کے سیاسی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منظر عام میں آیا۔ (۱۷)

وہ کہتے ہیں:

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
بازی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد
تجھ سے تقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ھَل مِن مزِید ' کہتے ہے رحمت دعا کے بعد ۱۸

حسرت نے موہان کا نام بلند کیا اور ان کے دم سے اردو شاعری ایک نئی راستے پر آئی۔ اردو شاعری کو وزن و وقار حاصل ہوا۔ ہماری روایتی شاعری طرح طرح کے معائب میں گرفتار تھی۔ مصنوعی اظہار عشق، رعایت لفظی، مبالغہ آرائی جیسے عیب اس زمانے کی شاعری میں عام طور پر نظر آتے ہیں، حسرت کی شاعری بڑی حد تک ان عیبوں سے پاک ہے۔ ان کے خیالات اور طرز ادا دونوں میں سادگی ہے مگر اس میں عامیانہ پن کہیں نظر نہیں آتا۔ عشقیہ خیالات کو ترک کر کے انہوں نے سیاسی رجحانات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ انہوں نے مسلمانوں کے گزرے ہوئے زمانے کو بڑی دور اندیشی سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ اردو ادب کے لئے ان کی خدمت ہمیشہ یادگار رہے گی۔

**حوالہ جات :**

(۱) کلیات حسرت موہانی، حصہ اول، صفحہ ۳۶۔۳۷

(۲) ایضاً، صفحہ ۳۷

(۳) An Introduction on tourism, published by: Banglads Tourism corporation publish date: 2003, Page - 08, volume-01

(۴) کلیات حسرت موہانی، حصہ اول، صفحہ ۶۹

(۵) ایضاً، صفحہ ۶۹۔۷۰

(۶) ایضاً، حصہ اول، صفحہ ۷۰

(۷) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی،، ایجوکیشنل بک ہائس، علی گڑھ، صفحہ ۱۷۵

(۸) کلیاتِ حسرت از حسرت موہانی، حصہ سیزدہم، صفحہ ۴۳۹۔

(۹) کلیاتِ حسرت از حسرت موہانی، مقام اشتراکیت، صفحہ ۴۳۸، کانپور ۱۹۴۵

(۱۰) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی،، ایجوکیشنل بک ہائس، علی گڑھ، صفحہ، ۱۷۶

(۱۱) کلیاتِ حسرت از حسرت موہانی، حصہ سیزدہم، صفحہ ۴۳۹۔

(۱۲) ایضاً۔ صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷

(۱۳) تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی،، ایجوکیشنل بک ہائس، علی گڑھ، صفحہ ۱۷۴

(۱۴) ایضاً، صفحہ ۱۷۶

(۱۵) ڈاکٹر کنیز بتول۔ آتش گل، ۲۰۰۶، صفحہ ۷۔۸

(۱۶) ایضاً، صفحہ ۔۲۱

(۱۷) ڈاکٹر رشید احمد، مولانا محمد علی جوہر مختصر حیات اور ادبی کارنامے، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، صفحہ ۔۱۱

(۱۸) محمد علی جوہر، دیوان جوہر، صفحہ نمبر ۔۱۲۰

# صوفی فتح علی ویسی کی شاعری میں اخلاقی اقدار کا تصور

ڈاکٹر محمد منصور عالم*

ہندوستان کے عظیم صوبوں میں بنگال کو کئی لحاظ سے ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ صوبہ سیکڑوں سال سے علماء فضلاء شعراء۔ ادبا اور صوفیا کرام کا گہوارا رہا ہے۔ یہاں دین اسلام کی اشاعت، اسلام علوم وفنون اور اس کی تعلیمات کی ترقی وترویج میں اہل کمال اور فنکاروں کے دوش بدوش صوفیا کرام اور بزرگانِ دین کی خدمات قابل بھی ستائش رہی ہیں۔ اس صوبے کے بزرگوں، صوفیوں اور شاعروں نے ملفوظات، مکتوبات، رشد وہدایات، پند ونصائح کے ذریعہ اخلاقی دروس اور اسلامی فکر ونظر کی اشاعت قرآن اور احادیث کی روشنی میں کی اور اسلامی زندگی کے احیاء اور ملت کو سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ دیا اور انہیں انحطاط اور پستی سے نکال کر فلاح وبہبود کی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ لیکن افسوس کہ ان میں بہت ایسے ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں۔ جن کا ذکر تاریخی اور مذہبی کتابوں میں درج ہے ان میں شیخ جلال تبریزی، شاہ جلال مجرد، شیخ یحییٰ منیری، حضرت ابوتوامہ، حضرت علاؤالحق پنڈوی، شیخ نور قطب عالم، شیخ سراج الدین عثمان، عبداللہ کرمانی، راہی پیر، حاجی بہرام سقا۔ حمید بنگالی دانشمند، شاہ نعمت اللہ مہر اور انیسویں صدی کے آخری حصے میں صوفی سید فتح علی ویسی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ صوفیا کرام تھے جنہوں نے بنگال میں نہ صرف اسلامی ماحول پیدا کیا بلکہ پرچم اسلام کو بلند کر کے لاکھوں غیر مسلم افراد کو دامن اسلام میں پناہ دلائی اور انہیں اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اور حکیمانہ شعور سے آراستہ کر کے چشمہ اسلام میں غوطہ لگانے کا ہنر سکھایا۔ ان صوفیا کرام نے ملفوظات اور اپنی

---

* سابق صدر شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام، انڈیا

شاعری کے ذریعہ حسن اخلاق کی اہمیت اجاگر کی اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ عمدہ عمدہ اعلیٰ خیالات اور اخلاقی و حکیمانہ دروس تصوف کی چاشنی کے ساتھ عوام الناس تک پہنچانے کا عمل انجام دیا۔

انیسویں صدی میں بنگال میں شاعری کا عام رواج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں کے علاوہ علماء اور صوفیا کرام نے بھی تبلیغ کا ذریعہ شاعری کو بنایا۔ راقم الحروف ان ہی کی جھرمٹ میں سے ایک ایسے صوفی شاعر اور عارف باللہ کو نکال کر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، جسے دنیا صوفی فتح علی ویسی کے نام سے جانتی اور مانتی ہے۔ فتح علی بنگال کے واحد صوفی ہیں جو صاحب دیوان ہیں جن کا کلام فقط نعتیہ غزلوں اور قصائد پر مبنی ہے اور جنہوں نے اپنے اشعار میں اخلاقی اور حکیمانہ مسائل سے بحث کی اور پند و نصائح کے ذریعہ اس کی تبلیغ کی۔ لیکن اس سے قبل کہ سید فتح علی ویسی کی اخلاقی شاعری سے بحث کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مختصر تعارف، اخلاق کی تعریف اور فارسی میں اخلاقی شاعری (Ethical Poetry) پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

صوفی فتح علی بن وارث علی بنگالی چاٹگام (موجودہ بنگلہ دیش) میں ۱۸۲۵ء میں متولد ہوئے۔ (۱) لیکن بہت جلد ان کا خاندان مرشد آباد ہجرت کر گیا جہاں انہوں نے اس وقت کے ایک مشہور مدرسہ دہسا میں، جو بشیر ہاٹ کے قریب ہے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بچپن سے ہی ذہین الطبع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے قلیل مدت میں انہوں نے قرآن، حدیث، منطق، فلسفہ اور اس وقت کے دیگر علوم اسلامی میں مہارت حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ عربی اور فارسی زبان و ادب پر بھی اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ چونکہ وہ شروع سے ہی صوفیانہ ذہن رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ۱۸۵۸ء میں نقشبندیہ سلسلے کے ایک صوفی نور محمد نظام پوری جو سید احمد بریلوی کے خلیفہ تھے، کی مریدی اختیار کر لی۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں بعد میں ویسی کلکتہ چلے آئے جہاں وہ نواب واجد علی شاہ مٹیا برج کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ کلکتہ میں اپنی

ابتدائی زندگی میں ہی انہوں نے مرشد آباد کے ایک معزز گھرانے کی خاتون مسمی سیّدہ فاطمہ سے نکاح کرلیا۔ شادی کے بعد ان کو سیاسی پنشن آفس میں سپرنٹنڈنٹ کی سرکاری ملازمت مل گئی۔ لیکن ویسی کے مزاج نے انہیں زیادہ دنوں تک ملازمت کرنے نہیں دیا ور لہٰذا انہوں نے ۱۸۶۵ء میں اس عہدے اسے استعفیٰ دے دیا اور اپنی زندگی کے بقیہ ایام مرشد آباد میں خلوت میں گذار دیئے۔ لیکن قسمت انہیں پھر کلکتہ لے آئی جہاں ایک سال کے بعد ۶ ردسمبر ۱۸۸۶ء کو وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے جہاں انہیں کلکتہ کے ایک مشہور علاقے مانک تلہ میں دفن کر دیا گیا۔ ان کا مزار آج بھی مرجع عوام الناس بنا ہوا ہے۔ (۲)

صوفی فتح علی ویسی جب تک باحیات رہے ان کی شہرت و مقبولیت کی وجہ ان کی علم دوستی، ذکاوت و ذہانت، فہم و ادراک عقل و دانش، اور معارف و علوم اسلامی میں درک تھی۔ خلقِ خدا سے ان کا لگاؤ، بشر دوستی، توکل، صبر و قناعت وغیرہ وہ خوبیاں تھیں بدرجہ اتم جو ان میں موجود تھیں۔ وہ صوفی تھے اس لئے ان کی فارسی شاعری تصوف و رموز معرفت اور اخلاقی اقدار کا بحرِ ذخار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تصوف اور افکار تصوف کو اخلاقی عظمت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ بنگال میں سماج کا ہر اصول اخلاق اور صوفیانہ رنگ و آہنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی ہونے کی وجہ سے ویسی نے اخلاق حسنہ کے تمام عناصر کو اپنی شاعری کا جز بنایا۔ اور اپنے معتقدین کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے ساتھ زمائم اخلاق مثلاً کبر و حسد، خشم، لالچ، بدگوئی نفرت، تعصب سے احتراز کی ہدایت دیتے رہے۔ اس سے قبل کے صوفی فتح علی ویسی کے اشعار میں اخلاقی مسائل اور اقدار کی جھلک کا پتہ چلایا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اخلاق کی تعریف کر دی جائے۔

**اخلاق کی تعریف:** لفظ اخلاق، خلق کی جمع ہے اور خلق کے معنی ہیں عادت، خصلت اور سیرت۔ علم الاخلاق وہ علم ہے جس میں کردارِ انسانی اور اس کی عادات و خصائل سے بحث کہ جاتی ہے۔ اس علم کا اصل موضوع سیرت انسانی ہے جس میں ان اصولوں کو زیر بحث لایا جائے جن پر انسان کو عمل پیرا ہونا چاہئے۔ صوفی اور

صوفی شاعروں نے اخلاق کے ان ہی فضائل کو اپنی شاعری کا جز بنا کر انسان میں ان خوبیوں کو پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ علم اخلاق اسلامی تعلیمات کا ایک اہم جز ہے۔ اس کا روزہ داروں اور نماز پڑھنے والوں کے برابر ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اسلام کی عمارت اخلاقی اصولوں پر قائم ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اخلاق روح اسلامی نظام حیات کے ہر شعبے میں جاری وساری ہے۔

بانئ اسلام اور مجسمہ اخلاق حضور اکرمؐ نے اپنی بعثت کا بڑا مقصد و مرکز اخلاق کے عروج کو ہی بتایا ہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ ''قیامت کے روز میرے سب سے نزدیک وہ ہوگا جس کا اخلاق اچھا ہوگا''۔ دور جہالت کے شعراء میں انہوں نے انہیں شعرا کی تعریف وتحسین کی جن کی شاعری میں اخلاقی قدریں اور حکمت کی باتیں اور توحید کا تصور ملتا تھا۔ جس کی وجہ سے عربی شاعری اخلاقی اقدار اور تصورات دین سے غنی سے غنی تر ہوگئی۔ امام غزالی نے اخلاق کی تعریف یوں کی ہے۔

> ''خلق نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئتِ راسخ کا نام ہے جس کی وجہ سے سہولت اور فکر اور توجہ کے بغیر ''نفس'' سے اعمال صادر ہوسکیں۔ پس یہ ہیئت اگر اسی طرح قائم ہے تو اس سے عقل اور شرح کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں اور اس کا خلق احسن ہے اور اگر اس سے غیر محمود اعمال صادر ہوئے ہیں تو اس کو بد اخلاقی کہتے ہیں''۔ (۴)

اخلاق ناصری کے مصنف کے مطابق:

> ''اخلاق آن علمی است بہ کہ آن نفس انسانی چگونہ خلقی اکتساب تواند کرد کہ جملگی احوال وافعال کہ بہ ارادۂ او از او صادر می شود، جمیل ومحمود بود''۔ (۵)

ایک ایرانی دانشور کے قول کا بھی ملاحظہ کرلیا جائے جو کہتا ہے کہ:

> ''مقصود از علم اخلاق، معرفت فضائل وکسب انہا است تا نفسِ بد آنہا آراستہ شود وشناخت رذائل نیز ضرورت دارد تا نفس از آنہا دوری جوید و پاکیزہ گردد''۔

ایک انگریز مفکر کا قول بھی یہاں درج کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"Ethics or Akhlaq ' may be defined as a set of moral principle that distinguishes what is right from the wrong. It is a noramative field because it prescribes what one should do or abstain form doing."

فارسی زبان وادب اپنے دائیرے میں کئی جہتیں رکھتا ہے۔ یہ بشر دوستی، مذہبی رواداری، محبت، اخلاق وخلوص کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ 'اخلاق کا منبع انسان کی وہ اندرونی صالح فطرت ہے جو خیر وشر اور معروف ومنکر کے درمیان خط امتیاز کو پہنچتی ہے اور اس کی اصل مذہب ہے۔ انسان کی چند خوبیاں مذہب کی وہ صداقتیں ہیں جو ابتدائے آفرینش سے تادم تحریر ابدی اور دائمی ہیں۔ مثلاً صداقت، امانت، دیانت، دانشوری، رواداری، خدمت خلق اور مفت وغیرہ۔ یہی وہ اخلاقی اقدار ہیں جن کا تعلق انسان کے وِجدان اور ضمیر سے ہے'۔ ادبی اور اخلاقی اقدار کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور دونوں کی ہم آہنگی سے ہی اعلیٰ شعری ادب کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔ فارسی ادب کے شعراء وادباء اور صوفیوں نے ادب اور اخلاق کو ہم آہنگ کر کے انسانیت کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور پند ونصائح کے ذریعہ اچھے بُرے کی تمیز کرائی ہے۔ ایک ایرانی دانشور کا قول ہے کہ

''دانشوران وعارفانِ ایرانی توسطِ شعر ونثر، دنیارا از نگاہِ بشر دوستی بنای دیدہ اندو بنای ادبیات ایرانی روی محبت واخوت نھادہ اند''۔

فارسی شاعری کا ابتدائی دور بھی وہاں کے مذہب واخلاق اور تہذیبی وسماجی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس زبان نے روحانی، اخلاقی پند ونصائح کی تعلیمی اور حکیمانہ وصوفیانہ مسائل کو توضیح وتوسیع میں حیرت انگیز روال ادا کیا ہے۔ اسلام کے بعد تصوف اور اخلاق کے اثر نے مجاز سے حقیقت کی طرف فارسی شاعری کے رخ کو موڑا۔ رودکی سے لیکر'' حافظ تک کے شعراء نے اخلاق اور پند ونصائح کو اپنی شاعری کا۔ موضوع

عشق بنایا۔ خود حافظ شیرازی نے بادہ و ساغر کے پردہ میں مشاہدۂ حق کی بات کی اور سعدی شیرازی نے محض اخلاق کو اپنی شاعری کا جزِ اعظم بنا دیا''۔ فارسی کے دوسرے صوفی شعراء نے اپنے کلام میں حقیقی کے مضامین، محبت حق، محبت رسولؐ اور اخلاق المکارم کے موضوعات فارسی میں داخل کئے۔ دینی اور دیگر مطالب بھی بہت حد تک تصوف کے ذریعہ ہی فارسی غزل یا دیگر اصناف کا حصہ بنے۔ ہم مشربیت، انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاق کے دیگر مضامین تعصب، ریاکاری فرقہ پرستی کے خلاف انکار بھی فارسی غزل یا دیگر اصناف سخن میں راہ پائے۔۔ صرف ایرانی شعراء نے ہی نہیں بلکہ ہندوستانی میں فارسی کے شعراء نے بھی اخلاقی ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

الغرض فارسی کا شعری ادب پند و نصائح و موعظت اور اخلاقیات کی تعلیم سے بھرا پڑا ہے بلکہ منبع اخلاقیات ہے شاعروں کے علاوہ نثر نگاروں بھی اس معاملے میں نہیں رہے چنانچہ اخلاق جلالی، لوائح جامی، کشف المحجوب، اخلاق محسنی، اخلاق ناصری، قابوس نامہ.....

جیسی کتابوں کا خاص موضوع اخلاق ہی ہے۔ گلستان جو اخلاق کا عظیم منبع قرار دیا گیا ہے۔ ویسی کی نعتیہ شاعری علم و معرفت عبرت و نصیحت، فکرمندی و دردمندی اخلاق و کردار اور درس انسانیت کا انمول خزانہ ہے جس سے ہر دور میں اہل نظر استفادہ کرتے ہیں اور اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اخلاق حسنہ کو اپناتے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ویسی کی شاعری میں اخلاقی مساوات خون بن کر دوڑتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

دین اسلام خلق کا ہی نام ہے اور تصوف کی حقیقت میں خلق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے پس جو شخص جس قدر اخلاق حسنہ کا مالک ہے اسی طرح دین اور تصوف میں بلند ہے یعنی جس طرح حسنِ اخلاق زینت دہِ انسانیت اور رونق دہ عالم ہے اسی طرح بداخلاقی تیرِ انسانیت اور برباد کن نظام کائنات ہے اور مادی و روحانی امراض کا سرچشمہ ''تصوف نہ تو رسم ہے نہ علم، یہ تو سراسر اخلاق ہے۔ اگر کوئی بندھا طریقہ ہوتا ہے تو

کو حاصل کیا جا سکتا تھا اور علم کو پڑھا جا سکتا تھا۔ یہ تو اخلاق ہے جسے خود میں پیدا کرنا ہوتا ہے''۔ یہ تو حقیقت ہے کہ شعراء نے خواہ وہ غیر صوفی ہوں یا صوفی آنحضرت کے مکارم الاخلاق سے متاثر ہو کر اشعار کہے۔ ویسی کی غزلیں اور قصائد نعت پند و نصائح کے لئے وقف ہیں۔ ویسی ان میں قرآنی آیات تضمین کرتے ہیں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر کرتے ہیں، انسان کو خواب غفلت سے جگاتے ہیں اور معرفت کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ انسانوں کو اخلاق حمیدہ کا درس دیتے ہیں۔ اس فن میں وہ نہ تو متانت کو کبھی ہاتھ سے جانے دیتے اور نہ ہی شعریت کو مجروح کرتے ہیں۔

قرآن و حدیث اور عشق نبی وہ اہم ستون اور منابع ہیں جن پر فتح علی ویسی کی صوفیانہ اور اخلاقی شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔ اسلامی علوم و معارف، ثقافتی افکار و عقائد اور اخلاقی آداب و شعور کے قطب مینار حضرت ویسی کی ساری زندگی اسلامی اصولوں اور اخلاق نبوی کی پیروکاری کا مظہر رہی ہے بنگال کے وہ تنہا صوفی ہیں جنہوں نے اپنی نعتیہ تخلیقات کے ذریعہ عوام الناس میں اخلاق مسائل کی اشاعت کی اور ان تمام اخلاقی معاملات کو جو حضور اکرمؐ سے متعلق ہیں، عام کر کے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان تمام عادات و اطوار و اخلاق حسنہ کو سنت سمجھ کر اپنایا جائے جس کی تلقین آقائے نامدار نے کی۔ لہٰذا اس سنت پر عمل کرنے کی وہ اس طرح تلقین کرتے ہیں۔

چون راہِ مستقیم بجز سنّت تو نیست — ویسی بجان گزیدہ رہ مستقیم را

روزِ محشر بہ ہمہ کس کار مشکل می شود — آنکہ زد چنگل بسنّت کار آسان نیست (۷)

دیوان ویسی

ڈاکٹر تنویر احمد کے مطابق:

''صوفی فتح علی ویسی چنان شاعرِ خوش کلام و قدرت مندِ زبان فارسی در بنگالہ بود

کہ باعقیدت وصداقتِ نہایت واخلاق وسوزِ درون وبا اہتمام وشغف خاص عشق رسول راچنان مطرح می کند تا پیروانِ دین اسلام بہ اتباع کاملی رسول خدا واخلاق حسنہ وی آمادہ شوند۔ ویسی در اشعار خود بہ شیوہ ھای گوناگون اہمیت وارزش حیات وتعلیمات نبویؐ را بہ سبک بلیغ وجالب توضیح می د ہد وحسنِ تخیل واحساسات درونی خود را در قالب شعری گنجاند "۔(۷)

ویسی نے اپنی شاعری میں صلح کل، بشر دوستی، صبر وقناعت، توکل انکساری، خاکساری اور تواضع جیسے اخلاق حسنہ کی تبلیغ کی جو حسنِ اخلاق انسانی میں بلندی اور رفعت کے جذبات کا مظہر ہے۔ لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ انسان میں پستی کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں رزائل اخلاق کہا جاتا ہے ۔ یہ دراصل حیوانی جذبات ہیں۔ جیسے غرور تکبر، حسد وجلن، ریاکاری، حرص وآز، دروغ گوئی ویسی نے ان رزائل سے بچنے کی بھی تلقین تھی کی۔ آیئے ویسی کے اشعار کی روشنی میں ہم اخلاق حمیدہ اور رزائل اخلاق کے حوالے سے ان کے کچھ خیالات جاننے کی کوشش کریں۔

چونکہ ویسی بلاشبہ ایک عارف کامل تھے۔ لہٰذا نعت لکھتے وقت وہ ہمیشہ تعلیماتِ قرآنی اور ذکر رسولؐ کیا کرتے تھے جو منبع اخلاق ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ حضور کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق حسنہ کی پیروی کی جائے اور اس پر عمل بھی ہو اس سلسلے میں دیکھئے وہ کیا تلقین کرتے ہیں۔

دست زن ہاں بدامن قرآن　　چنگ زن ھیں بدامن اخیار

عترت او سفینۂ نوح اند　　بی سفینہ نجات شد دشوار (۸)

## توکل

توکل کے لغوی معنی کسی پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کے ہیں۔ اس لفظ کے مادہ میں عاجزی کا مفہوم پایا جاتا ہے جو اخلاق حسنہ کا ایک اہم حصہ ہے توکل صوفیوں کا ایک خاص طریقہ حیات رہا ہے۔ ویسی فرماتے

ہیں اللہ پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔

نیک و بد را حوالہ کن بہ خدا　　ھم توکل بہ خالق غفار

خیر از نفع و ضرر ھر دو جہان　　وز ترحشر دھر است بدار (۹)

## قناعت و صبر

مقام تصوف میں قناعت اور صبر کا مقام اعلیٰ و ارفع ہے۔ کیوں کہ ان خوبیوں کے بغیر شخص رضائے الٰہی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح صبر کے بغیر انسان راہ حق میں مجاہدہ کر سکتا ہے اور نہ اسے ضرف شیاطین کے مقابلے میں فتح حاصل ہو سکتی ہے اور نہ اسے تقویٰ کی نعمت میسر ہو سکتی ہے۔ بزرگوں نے قناعت اور صبر کو ایمان کا اہم جز قرار دیا ہے۔ جو صابر ہوگا وہی قانع بھی ہوگا۔ اخلاق کے اس مسئلے کو ویسی اس طرح شعری پیرھن عطا کرتے ہیں۔

آن عزتِ من نیست کہ باشم بہ سلاطین　　ماتم گدیان درت عزّ تم این است (۱۱)

## خاکساری و نیکوکاری

خاکساری، انکساری، نیکوکاری، صلح و دوستی اور توضع، اخلاق کے اہم عناصر ہیں۔ یہ خوبیاں انسانی فضائل و کمالات کا ایک بڑا وصف ہیں، ویسی انسانوں کو ان اخلاقی شعور کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ شعر دیکھئے۔

خاکسار نمای پیشہ خود　　نفس امّارہ را بر آرود مار (۱۰)

## صداقت و صاف گوئی

دونوں اوصاف حضورؐ کے اوصاف حمیدہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ صادق ہمیشہ دنیا میں سرخرو ہوتا ہے۔ ویسی انسان کو دونوں اخلاق اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

گرتو صادق بقول خویشتنی　　استواری اگر برین گفتار (۱۲)

## غرور وتکبر

یہ اخلاقی عیب ہے جس کو سماج میں برا مانا گیا ہے۔ یہ آدمی کو آدمیت سے دور کر رہتا ہے۔ اور انسانی مدارج کی برتریوں تک پہنچنے میں حائل ہوتی ہے۔ امام غزالی نے کہا ہے کہ ''خوب غور کرلو کہ تکبر اور خود بینی فضائل سے دور کر دیتے ہیں اور رزائل کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور تیری رزالت کے لئے اتنا کافی ہے کہ تکبر تجھے نصیحت سننے نہیں دیتا اور تو بھی اچھی عادتوں کے قبول کرنے سے پس وپیش کرتا ہے''۔ فرمان نبوی ہے کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوتا ہے (۱۳) گویا حسنِ اخلاق کے بارے میں سوئے اخلاق کا سب سے نمایاں مظہر یہی تکبر ہے۔ ویسی صوفی صافی تھے بھلا اس بداخلاقی کے خلاف کیوں نہیں اظہار کرتے۔ شعر دیکھئے۔

ہمچوں حیوان بہ تن شدی مغرور　　تن تو تندرست ودل بیمار

دور کن از دماغ باد غرور　　پاک کن سینہ را از کبر وغبار ۱۴

---

برزہد و مال و جاہ کہ داری مکن غرور　　ای دل بہوش باش کہ انجام مبہم است (۱۵)

## حرص وآز

حرص ولالچ بھی اخلاقی رزائل میں شمار ہوتے ہیں۔ شعرائے فارسی نے انسان کو ان عیوب سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ ویسی بھی اپنے انداز میں اس عمل کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ دیکھئے اشعار

تا کبی بندگی آز دھوا　　تا کبی فتنہ سر ضیاع وعقائد

تا نرسی ز کبر ونخوت وآز　　استگاری ترا بود دشوار (۱۶)

دوسرا شعر

دل گرفتار داء حرص و ہوا　　کی کشاید بدل در اسرار (۱۷)

ان عیوب سے بچنے کی ترکیب بھی بتاتے ہیں۔ دیکھئے۔

گر تو خواہی فلاحِ ہر دو جہاں　　وانہ جوی نجات آخر کار

دست دامنِ محمدؐ زن　　سوز ورہش ساز کحل دیدہ غبار (۱۸)

ریاکاری و مکاری

حافظؔ اور دوسرے شعراء کی طرح وسیمی ریاکاری و مکاری کو اخلاق رزائل میں شمار کرتے ہیں۔ واعظ قافیہ کے ساتھ ان کی ایک پوری غزل ان کے دیوان میں موجود ہے۔ دو شعار ملاحظہ کریں۔

ہیچ سودی ند ہ پندارای واعظ　　میدھی پند بہ بیہودہ چراای واعظ

ترک کن زہد وریائی وغم جاناں بگیر　　ز ہ خشکت ند ہ صدق وصفاای واعظ (۱۹)

---

تکہ بر دولت جہاں نمای　　دل برین دار بمید ار موار (۲۰)

زاہد ریاکار پر چوٹ لکھتے ہیں۔

از برون چون کعبہ روشن، وز درون تیرہ چو کفر　　حیف اندر کعبہ پنہاں کافرستان داشتن (۲۱)

بے ثباتی دنیا

بے ثباتی دنیا اور دنیا کی بے وفائی فارسی کے شاعروں کا اہم موضوع رہے ہیں۔ وسیمی نے بھی اس موضوع کے متعلق بے ثباتی دنیا کے حوالے سے اشعار کہے ہیں اور اس سے دل لگانے سے منع کرتے ہیں۔ دیکھئے۔

دنیا زنی است عشوہ گر و بی وفا سرشت ای دل مشو بہ عشوہ او شاد مان عبث (۲۲)

---

غرہ مشو کہ گردش گیتی بکام تست ازرہ مرد کہ نفس تو کلب معلم است (۲۳)

---

نادان گمان کند کہ بناء جہاں قوی است دانا یقین کند کہ اساسش نہ محکم است (۲۴)

---

دل چہ بندی در این سرای غرور جان چہ بازی بیحیفہ شہدار
پُر حذر زین سرای پُر غوغا گوش کن پند چون در شہوار (۲۵)

## در مذمت شراب

شراب ام الخبائث ہے۔ یہ انسان کی تمام اخلاقی خوبیوں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایک صوفی شاعر کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان کو اخلاقی تعلیم دیتے وقت اس فعل قبیح سے بچنے کی بھی تلقین کرے ہیں۔ ویسی اس فرض کو بھی ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چند کیف مئی بسر مستی چند از بہر مئی خمار (۲۶)

دوسرے شعر میں تاکید فرماتے ہیں کہ:

خمر بگذار و مست جنّش باش مدت بی مئی مدام باش ای یار (۲۷)

## بُری صحبت

اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور برے لوگوں کی صحبت سے بچنے کی تلقین تقریباً ہر شاعر نے کی

ہے۔ ویسی ایسے لوگوں سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں جن کی صحبت میں رہ کر اخلاقی شعور کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان اخلاقی رزائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

النجاۃ النجاۃ ازین فساق — الامان الامان ازین کفار

صحبت شان ترا کند رسوا — الفت شان ترا کشد در نار

نیست سودی بصحبت اینان — نیست خیری بنزد ایں فجار

باش از اختلاط ایشان دور — ہم زرفتار شان بگیر کنار (۲۸)

## مال وزر

ویسی کی فارسی شاعری میں اخلاقی اقدار و شعور کے حوالے سے ایک نہایت ہی عمدہ اور اعلیٰ درجے کا درس ملتا ہے۔ انسان کو مال و دولت کے حصول اور اس کو جمع کرنے کی کوشش میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ یہ وہ شئے ہے جو انسان کے اخلاق و عادات کو بری طرح متاثر کر کے اسے برباد کر دیتی ہے۔ حصول دولت کی طلب میں وہ اتنا بہک جاتا ہے کہ احرام اور ناجائز میں کوئی تمیز نہیں رکھتا۔ ویسی اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ مخرب اخلاق یعنی ہوس مال وزر سے اجتناب برتنا چاہتے۔ فرماتے ہیں۔

تا بکی اقتدا بد یو لعین — تا بکی بندۂ زر و دینار (۲۹)

---

بر نعمتش منال کہ نعمت در و نہانست — بر دولتش منا ز کہ نکبت در و ضم است (۳۰)

## علم و دانشوری

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں علم کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ علم ہی ہے جو انسان کو انسان تہذیب و اخلاقی اقدار سے آراستہ و پیراستہ کرتا ہے۔ ویسی نے حصول علم پر زور دیا اور اس کے ساتھ عمل کو بھی اہم گردانا۔ بے عمل علم کو پر تنقید بھی کی۔ بے عمل عالم کے حوالے سے کہتا ہے کہ

علم خواندیم وجہل رہبر ما　　عقل داریم وابلہیم بکار (۳۱)

کسب ہنر وعلم کے بارے میں شعر ملاحظہ ہو:

دست داریم ودستگاھی نہ　　نطق داریم وگنگ در گفتار (۳۲)

**جدوجہد**

جو شخص اخلاق مند ہوگا وہ ہر کام میں محنت کو شامل رکھے گا۔ ویسی خاص طور پر جوانوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ کسی بھی چیز کے حصول میں جدوجہد اور کوشش کو جاری رکھو اللہ کوشش کا پھل ضرور دیتا ہے اور انسان کی زندگی کا ہر فعل اخلاق سے مربوط ہے۔ شعر دیکھئے۔

سعی کن سعی تا زدر درہی　　جہد کن جہد تا رھی زآزاد (۳۳)

**دنیا پرستی**

حُبِّ جہان از دل خود کن برون　　در گذر از راحت ورنج جہان (۳۴)

**در شکر**

حضور کی اخلاقی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کیا جائے۔ انسان اللہ کی نعمتوں سے کیسے انکار کرسکتا ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید میں سورہ رحمان موجود ہے۔ صوفیوں نے اس اخلاقی فرض سے عہدہ برآنے کی تلقین کی ہے۔ شعر دیکھئے۔

شکر را پیشہ ساز در ہمہ حال　　ھم رضا کن شعار در ہمہ کار (۳۵)

ویسی کے درج بالا اشعار واقوال کے تناظر میں ہمیں اخلاقی قدروں کی وسعت اور معنویت کا انداز ہوتا ہے۔ اس سیاق وسباق میں ہمیں معلوم ہوا کہ ویسی کی شاعری کس قدر اخلاقی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں آقائے نامدار کے اخلاق کی مثالیں پیش کرکے انسان کو ایک خاص زندگی کا پیغام دیا ہے۔

ویسی کی نعتیہ شاعری نے روحانی واخلاقی پند ونصائح کی تعلیم اور حکیمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل کی

توضیح وتوسیع میں حیرت انگیز رول ادا کیا۔ وہ اخلاقی قدروں کے امین اور پابند تھے۔ لہٰذا ان سے بہتر اس چیز کو اور کون جان سکتا تھا کہ انسانی زندگی میں افرادی اور اجتماعی طور پر اخلاق کو جو جگہ حاصل ہے وہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے بہتر جگہ کسی اور چیز کے حصے میں نہیں آسکتی۔ ہر وم، ہر مذہب میں ہر زمانے میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ فارسی کے تقریباً تمام شعراء کے یہاں کس نہ کسی شکل میں اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ اس لئے کہ روحانی، دماغی، مادی غرض کسی قسم کی ترقی بھی بغیر اخلاق کے ممکن نہیں۔ ترقی کی عمارت جن بنیادوں پر استوار ہے ان میں ایک اخلاق ہے۔ ترقی کے دوسرے عناصر اور اخلاق میں عمل اور ردّعمل کا تعلق ہے دوسرے عناصر اخلاق کو آگے بڑھاتے ہیں اور اخلاق دوسرے عناصر کو اور اس طرح انسانیت کی شاہ راہ ترقی پر گامزن ہے۔ ویسی انسان کی افرادی اخلاق اصلاح ہی کے داعی نہیں تھے۔ بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتے تھے جو اس کے قومی اور نسل نقطہ کو بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بلکہ ویسی اپنے نعتیہ اشعار کے ذریعہ عوام الناس کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں اخلاقی رنگ و آہنگ بھر کر انہیں عمدہ اور نیک زندگی گذارنے کا درس دیتے رہیں۔ وہ ۱۹ ویں صدی میں بنگال کی عدیم المثال شخصیت تھے جنہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں شریعت کو مدنیت کے ساتھ، حقیقت کو مصلحت کے ساتھ اور عرفان کو واقعیت کے ساتھ پیش کیا۔ ویسی کی شاعری میں اخلاقی اقدار یہ چند پہلو ہیں جو ان کے نعتیہ کلام کے دوسرے پہلوؤں کی طرح ممیز اور ممتاز ہیں اور بنگال میں ان کا پایہ بلند ہے۔ تقریباً اٹھارہ انیس سال تک رشد وہدایت کے کاموں میں مشغول رہنے کے بعد ۶۱ سال کی عمر میں یعنی ۶ ردسمبر ۱۸۸۶ء کو وہ کلکتہ میں فوت ہو گئے۔ آج جبکہ ہندوستانی سماج اخلاقی گراوٹ کی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ ہر چہار جانب نفرت اور دشمنی کا دار دورہ۔ اس سے بچنے کا واحد علاج اخلاق کا حصول ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جس سے بڑے سے بڑا قلع محبت واخلاق کا گیت گانے لگتا ہے۔

☆☆☆

## حوالے ومنابع


۲۔آئینہ ویسی، مصنف مطبع الرحمان صفحہ

۲۔ایضاً ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۸۵۔۱۴۶

۴۔احیاء العلوم الدین، از امام غزالی جلد ۳ صفحہ ۵۶

۵۔اخلاق ناصری، خواجہ نصیر الدین، موسسہ مطالعات
فرھنگی ۱۳۶۹ صفحہ ۹۸

۶۔دیوان ویسی صفحہ

۷۔انڈوایرینکا (صوفی فتح ویسی نمبر) شمار

۸۔دیوان ویسی، ۵واں، ایڈیشن ۲۰۰۷ صفحہ ۸۷

۹۔ایضاً صفحہ ۸۴

۱۰۔ایضاً صفحہ ۸

۱۱۔ ایضاً صفحہ ۸

۱۲۔ایضاً صفحہ ۸۷

۱۳۔مکاتف القلوب باب ۱۴

۱۴۔دیوان ویسی صفحہ ۱۹۱

۱۵۔ ایضاً صفحہ ۱۹۱

۱۶۔ایضاً صفحہ ۱۵

۱۷۔ایضاً صفحہ ۸۱

۱۸۔ایضاً صفحہ ۸۴

۱۹۔ ایضاً صفحہ ۱۲۳

۲۰۔ایضاً صفحہ۸۴

۲۱۔ ایضاً صفحہ۱۳۹

۲۲۔ایضاً صفحہ۵۶

۲۳۔ایضاً صفحہ۱۹۰

۲۴۔ایضاً

۲۵۔ ایضاً صفحہ۸۲

۲۶۔ایضاً صفحہ۷۸

۲۷۔ایضاً صفحہ

۲۸۔ایضاً صفحہ۸۳

۲۹۔ ایضاً صفحہ۸۱

۳۰۔ایضاً صفحہ۱۹۰

۳۱۔ ایضاً صفحہ۸۱

۳۲۔ایضاً صفحہ۸۱

۳۳۔ایضاً

۳۴۔ایضاً صفحہ۱۹۴

۳۵۔ ایضاً صفحہ۸۴

# عادل شاہی عہد میں اردو ادب: ایک مختصر جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیر الدین☆

دو یا کئی زبانوں کے میل جول سے کبھی کبھی ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر زبان وجود میں آنے کے لئے دو یا چار سال کافی نہیں ہوتے بلکہ صدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو زبان بھی اس قاعدے اور طریقہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اس زبان کا وجود عربی، فارسی اور ہندستانی زبانوں کے آپس میں اختلاط سے ہوا ہے۔ ا

تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ آج کی اردو زبان مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکاری گئی۔ جن میں کھڑی بولی، زبان اردوئے معلیٰ، ہندی، ہندوی، ہندوستانی، ریختہ، دہلوی، گجری، گجراتی اور دکنی قابل ذکر ہیں۔ ماہرین لسانیات کی تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں اردو کو دکنی سے موسوم کیا گیا۔ دکن سنسکرت لفظ ''دکشن'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کے معنی ''جنوب'' کے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے دکن کا علاقہ موجودہ ریاستوں آندھرا پردیش، مہارشٹر، کرناٹک اور تامل ناڈو کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ ۲

دکنی ہند میں اردو کا پھیلنا کچھ مختلف طریقہ سے ہوا۔ تاریخ ہندوستان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزی سلطنت کے قیام سے پہلے جنوبی ہند بالعموم شمالی ہند کے اثر اور حکمرانی سے تقریباً آزاد رہا۔ شمالی ہندوستان جب مسلمان بادشاہوں کے زیر نگران آ گیا تو ان کی نظریں دکن کی طرف بھی اٹھنے لگیں۔ علاء الدین خلجی پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے شمالی ہند میں مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد دکن پر حملے شروع کر دیئے۔ اس طرح دہلی اور دکن سے آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خلجی کے دور میں

* پروفیسر اور چیئرمین، شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

اسلامی فوجیں دکن میں داخل ہوئیں تو آپسی میل و ملاپ سے اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچا۔

۱۳۲۹ء میں محمد بن تغلق نے دہلی کی بجائے دکن کے شہر دیوگری کو دولت آباد کا نام دیکر اپنا دارالسلطنت بنالیا۔۳ یہ شہر اس کو اتنا پسند آیا کہ اس نے حکم دے دیا کہ ہر شخص دہلی سے دکن چلا جائے۔ شاہی حکم تھا، اس لئے سپاہیوں اور شاہی ملازموں کے ساتھ تقریباً ساری آبادی دہلی سے دکن پہنچی۔ ان کے ساتھ نئی زبان وتہذیب بھی دکن پہنچی۔ اس نئی زبان کا اثر تیزی سے وہاں کے لوگوں میں پھیلنے لگا۔ واضح ہو کہ اس سے پہلے دکنی ہند میں دراوڑی خاندان کی کئی زبانیں جیسے تلینگو، کنڑی، تامل وغیرہ رائج تھیں۔ اہل دکن اور شمالی ہند کے باشندوں کے میل و ملاپ سے قدیم اردو (ہندوی) وجود مین آئی جسے دکنی اردو بھی کہا جاتا ہے۔ صوفیا نے دکنی اردو میں تبلیغ کا کام کیا تو اس زبان کی ترقی ہونے لگی۔

اردو ادب کی تاریخ میں دکنی اردو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ شمالی ہند کے مقابلہ میں دکن میں اردو کا چرچا بعد میں ہوا مگر شمالی ہند سے دکن میں اس کا چرچا سب سے زیادہ ہوا۔ اس لئے کہ نظم اور نثر دونوں ہی کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ یعنی اردو نے ادبی صورت دکن میں ہی اختیار کی۔ دکن میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ اس زبان میں بہمنی دور سے ملنے لگا۔ دکن کی خودمختار بہمنی سلطنت کا آغاز ۱۳۴۷ء سے ہوتا ہے۔۴ دکن پر بہمنی سلطنت ۱۴۹۵ء تک قائم رہی اور اس دور میں بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ بادشاہ گزرے۔ اس دور کے تمام بادشاہ اردو ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بہمنی دور میں جنھوں نے اردو ادب کی اشاعت میں اہم کردار ادا کئے ہیں ان میں سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز، سید محمد اکبر حسینی، نظامی، صدرالدین، عبداللہ حسینی، مشتاق، لطفی، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم وغیرہ کے نام نہایت قابل ذکر ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن کا علاقہ پانچ خودمختار سلطنتوں میں تقسیم ہوگیا (جیسے بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور گجرات)۔ مگر اس زبان کی ترقی برابر جاری رہی اور بہت نامی گرامی شعراء اور نثر نگار پیدا

ہوئے۔ بیجاپور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، بیدر میں برید شاہی اور گجرات میں عماد شاہی سلطنت قائم ہوئی۔ ان میں بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں کو دکنی زبان وادب کی نشوونما کے سلسلے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ۵ عادل شاہی خاندان کا بانی یوسف عادل شاہ ہے جس کو سلاطین ترکی کے خاندان عثمانیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ بہمنی دور میں وہ بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ بہمنی سلطنت کے چودھویں حکمران محمود شاہ کی غفلت وکمزوری سے جب سلطنت کا زوال شروع ہوا تو یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ء میں خودمختاری کا اعلان کر دیا اور علاقہ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجاپور میں عادل شاہی حکومت قائم کی۔ ۶ تقریباً دوسو سال (۱۴۹۰ء-۱۶۸۶ء) تک یوسف عادل شاہ سے لے کر سکندر عادل شاہ تک نو (۹) بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

| | |
|---|---|
| (۱) یوسف عادل شاہ | ۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۸ء |
| (۲) اسماعیل عادل شاہ | ۱۵۱۸ء سے ۱۵۳۴ء |
| (۳) ملو عادل شاہ | ۱۵۳۴ء سے ۱۵۳۴ء |
| (۴) ابراہیم عادل شاہ اول | ۱۵۳۴ء سے ۱۵۵۷ء |
| (۵) علی عادل شاہ اول | ۱۵۵۷ء سے ۱۵۸۰ء |
| (۶) ابراہیم عادل شاہ ثانی | ۱۵۸۰ء سے ۱۶۲۶ء |
| (۷) محمد عادل شاہ | ۱۶۲۶ء سے ۱۶۵۷ء |
| (۸) علی عادل شاہ ثانی | ۱۶۵۷ء سے ۱۶۷۳ء |
| (۹) سکندر عادل شاہ | ۱۶۷۳ء سے ۱۶۷۶ء |

عادل شاہی سلطنت کے قیام سے بیجاپور میں اردو زبان عام ہوگئی تھی۔ امیر غریب ادنی اعلی سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ بیجاپور کے اکثر حکمران خود عالم وشاعر اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ بہمنی

سلاطین نے اردو کو دفتری زبان بنادیا تھا۔ عادل شاہی عہد کے پہلے اور دوسرے بادشاہ یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسماعیل عادل شاہ نے اپنے زمانہ میں پھر اردو کی جگہ فارسی زبان رائج کیا اور تقریباً پچاس سال تک دفتر پر فارسی کی حکومت رہی۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ اول نے جب تاج وتخت حاصل کیا تو اس نے فارسی کی بجائے دوبارہ اردو کو رواج دیا۔ اس کے بعد پھر سلطنت کے ساتھ زبان کی قسمت پلٹی یعنی ابراہیم کے جانشیں علی عادل شاہ نے پھر فارسی کو رائج کیا۔ لیکن پھر اس کے جانشیں ابراہیم عادل شاہ ثانی جب حکمران ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اردو زبان جاری ہوگئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔ مندرجہ ذیل عادل شاہی عہد میں اردو ادب کی اشاعت میں جنھوں نے اہم کردار ادا کیا ان کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

## شاہ میراں جی شمس العشاق

شاہ میراں جی شمس العشاق اپنے وقت کے ایک زبردست صوفی بزرگ تھے۔ ان کی ولادت ۱۴۹۶ء میں مکہ معظمہ میں اور وفات ۱۵۶۱ء میں بیجاپور میں ہوئی۔ ۷ بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ تبلیغ کے لئے دکنی زبان استعمال کرتے تھے۔ دکن کے بڑے علماء وصوفیا میں ان کا شمار ہے۔ ان کی تمام تصانیف اردو نثر یا نظم میں ہیں۔ نثری تصانیف میں شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، گل باس اور دو مثنویاں خوش نامہ اور خوش نغز قابل ذکر ہیں۔ شہادت التحقیق ان کی سب سے زیادہ اہم اور طویل نظم ہے۔ ان کی تصانیف کا موضوع تصوف تھا۔ ان کے کارنامے اگرچہ ادبی حیثیت سے زیادہ اہم نہیں ہیں لیکن لسانیاتی نقط ؟ نظر سے اردو ادب میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

خوش نامہ

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نور علی نور

کھنڈیا خوش خوش نامہ تحت ہوا تمام

خوش سب کوئی دایم جیسا خود دھن عوام ۸

**خوش نغز**

شریعت کن بوجھے پورا طریقت کچ کرے

حقیقت ہو نیچا دیکھے معرفت سو تھرے

سوتی سو کرے کرے دیکھے دیکھے تو کچ بھوک

شکر کا کریا ہوئے پورا نہیں تو دو نا روک ۹

**شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری**

شاہ برہان الدین جانم (۱۵۵۴ء-۱۵۹۹ء) شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ باپ کی طرح صوفی اور عالم تھے۔ سلطان عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کا زمانہ پایا۔ کئی تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ جن میں وصیت الہادی، رموز الواصلین، بشارت الذکر، ارشاد نامہ اور کلمتہ الحقائق قابل ذکر ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کی کتابوں کا موضوع زیادہ تر تصوف ہے۔ لیکن کبھی کبھی غزلیں بھی کہی ہیں۔ طرز بیان سادہ تھا۔ فارسی اور عربی کے الفاظ بہت کم استعمال کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

اللہ واحد سر جہار — دو جگ رجنا رجیا اپار

سگل عالم کیا ظہور — اپنے باطن کیرے ظہور

کوئی کہیں سب عشق تمام — عشق کی آنکھیں کیا ہے فہام ۱۰

**ابراہیم عادل شاہ ثانی**

عادل شاہی عہد کا چھٹا حکمران سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء سے ۱۶۲۶ء) شہنشاہ اکبر جہانگیر اور محمد قلی قطب شاہ کا ہمعصر اور بڑے بلند پایہ عالم تھے۔ یہ نہ صرف علم دوست اور عالموں وصوفیوں کا قدرداں تھے بلکہ خود بھی ایک اچھا شاعر تھے۔ اس کا تخلص ابراہیم تھا۔ سنگیت میں وہ جگت گرو کہلاتا تھا۔۱۱ اردو زبان سے اس کو بہت دلچسپی تھی۔ اس نے فن موسیقی پر ہندی (اردو) نظم میں ایک مشہور کتاب نورس لکھی۔ یہ پوری کتاب اگرچہ دکنی میں نہیں ہے لیکن بعض راگ اور راگنیاں دکنی میں ہیں۔ اور ظاہر کرتی ہیں کہ کلاسکل موسیقی کے لئے بھی اس زمانے میں دکنی بول استعمال کئے گئے۔ ابراہیم کی زبان موسیقی کی اصطلاحوں اور بحروں اور اس زمانے میں موسیقی کے لئے جو لفظی خزانہ رائج تھا اس سے معمور ہے۔ اس لئے عام دکنی کتابوں اور نظموں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اس کی بحریں بھی عام دکنی کتابوں کی بحروں سے الگ ہیں۔ اس میں سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی مدح کے چند شعر یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| سید محمد پتی میرا | جیوں رتن میں اتم ہیرا |
| محل محل صور سنوارے | اس نمونے بہشت اپارے |
| ائت ہوتا ہے سدا بہارے | ارتی لیاے انبر بھر تارے |
| کدم کستوری جو چندن لاے | بادل کانسے ہور نگ برساے ۱۲ |

ابراہیم عادل شاہ ثانی نہ صرف ایک صاحب کمال شاعر تھے بلکہ شاعروں کا سرپرست بھی تھے۔ وہ اپنے زمانے میں مختلف ملکوں کے شاعروں، عالموں، صوفیوں اور اولیاء اللہ کو بیجاپور لے آئے۔ جن میں علامہ نورالدین ظہوری، مولانا ملک قمی، شیخ علم اللہ محدث، ملا رفیع الدین شیرازی، حکیم محمد ابوالقاسم فرشتہ اور شاہ صبغت اللہ کا نام نہایت قابل ذکر ہیں۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۲۶ء میں وفات پائی۔۱۳

اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا۔ ظہوری کی دو کتابیں 'خوان خلیل' اور 'گلزار ابراہیم'، عادل شاہ کے نام

پر ہیں۔ظہوری نے بادشاہ کی مشہور کتاب نوس کا دیباچہ فارسی میں لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی فارسی نثر کی ایک بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ رفیع الدین شیرازی نے سلاطین بیجاپور کی اہم تاریخ تذکرۃ الملوک لکھی۔ محمد قاسم فرشتہ نے ابراہیم عادل شاہ ہی کے حکم سے ممالک ہند کی بیمثال تاریخی کتاب لکھی جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ مختصر یہ ہے کہ عادل شاہی عہد میں اردو ادب کی ترویج واشاعت میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے سب سے زیادہ حصہ ادا کیا۔ سید شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

''ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرود ہندی میں ایک کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویئے اسے جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اس نے علم موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد وضوابط قلمبند کئے تھے اور اس کا نام "نورس نامہ" رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے۔ ملاظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے''۔ ۱۴

## عبدل بیجاپوری

عادل شاہی عہد کا ایک شاعر عبدل ہے جس نے ۱۶۰۳ء میں سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کے حالات خود اس کے حکم سے ایک طویل مثنوی "ابراہیم نامہ" دکھنی زبان میں قلمبند کی۔ چنانچہ عبدل بیان کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ نے یاد فرمایا اور حکم دیا کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس کا جواب نہ ہو۔ اس نے عرض کیا کہ اس کو صرف ہندی (دکھنی) زبان آتی ہے۔ عرب اور عجم کی کسی زبان سے واقف نہیں تو سلطان نے حکم دیا اسی زبان مین لکھی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ اس میں تقریبًا سات سو پچاس شعر ہیں۔ اس میں حمد ونعت منقبت کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ ۱۵

اگر چہ یہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ کی پوری سوانح عمری نہیں ہے۔ لیکن اس میں سلطان کی خانگی زندگی کے حالات ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس طرح ادبی اور لسانی اہمیت کے ساتھ تاریخی لحاظ

سے بھی قابل قدر ہے۔ ابراہیم نامہ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں — اگر کچھ رہے تو بچن شعر جاں
سو یوں بچن سن شاہ استادکاں — پوچھا جگت گرو کہہ کس زباں
زباں ہندوی مجھ سوں ہور دہلوی — نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی
کہیا شاہ استاد عبدل سویوں — تو ہر اک زباں کر شعر بات کوں ۱۶

## مقیمی بیجاپوری:

محمد مقیم نام، مقیمی تخلص فارسی کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ ایران سے ابراہیم عادل شاہ کی شہرت سن کر بیجاپور آیا تھا۔ بیجاپور کی اردو نوازی سے متاثر ہو کر ۱۶۳۸ء میں ایک اردو مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' لکھی تھی جس میں ایک ہندو شہزادی چندر بدن اور مسلمان تاجرزادہ محی الدین (مہیار) کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ ۱۷

نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"چونکہ مقیمی ایرانی شخص تھا اور فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ اس لئے اردو شاعری میں اس نے نام پیدا نہیں کیا، اس کی مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔" ۱۸

مقیمی کے کلام کا نمونہ پیش ہے:

خدا کون سزاوار کبر و منی — اور قادر ہے قدرت کا صاحب دھنی
جو یوں کیا آدم یک ارواج کوں — بسالیا ہے طوفان نے تو نوح کوں
کیا تار گلزار رب الجلیل — کہ نمرود کے ہات بانچیا خلیل ۱۹

**علی عادل شاہ ثانی:**

محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۷ء سے ۱۶۷۳ء) تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ خود بھی اردو کے بہت بڑے اور اچھے شاعر تھے وراپنے باپ اور دادا کی طرح شاعروں کا سرپرست تھے۔ علی عادل کا تخلص شاہی تھا۔ اس نے غزلیں، قصیدے، مثنوی سب لکھی ہیں اور اپنے دادا ابراہیم کی طرح موسیقی کی راگ راگنیاں بھی منظوم کی ہیں۔ اس کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور رعنائی بھی۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''شاہی کے قصیدے جہاں مشکل بحروں ہیں تو وہاں اس نے آسان بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ اس کی مثنویاں
واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کی غزلیں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی تخیل کی بلند پروازی
کو ظاہر کرتی ہیں۔ صفائی اور سادگی اس کے کلام کے گویا لوازم ہیں۔'' ۲۰

مثال کے طور پر اس کی غزل کے چند شعر حسب ذیل ہے:

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو
یاقوت ہور مرجان میں کوہی رتن برتر کہو
بولے جہاں کے پارکھی ہمنانہ آوے بولنا
تمنا سہاتا بولنا اے شاہ بحرو بر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جن ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو ۲۱

**نصرتی:**

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص اردو کا ایک بہت بڑا شاعر تھا۔ اورنگ زیب نے جب بیجاپور فتح کیا تھا تو یہ

موجود تھے۔ نصرتی کا باپ اپنے وقت کے لوگوں میں بہت باوقار و بااثر تھا۔ چنانچہ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں سلطان علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی۔ جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی کو ملک الشعراء کا خطاب عطا ہوا۔ تین مثنویاں جیسے گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری اور ایک دیوان ان کی یادگار ہیں۔

" گلشن عشق" ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ۱۶۵۷ء میں لکھی گئی۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ دوسری مثنوی "علی نامہ" ایک رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۶۶۵ء میں لکھی گئی۔ اس میں علی عادل شاہ ثانی کے دور حکومت کے ابتدائی دس برس کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ شاہنامہ کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کو دکنی زبان کا شاہنامہ کہا گیا ہے۔ اس مثنوی میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری دونوں کا کمال نظر آتا ہے اور جابجا جنگ کے جیتے جاگتے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ "علی نامہ" کو ایک بلند پایہ مثنوی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ۲۲ مثنوی تاریخ اسکندری سکندر عادل شاہ کے زمانہ پر مشتمل ہے۔

دیوان نصرتی میں غزلیات کے علاوہ دوسری اصناف بھی ملتی ہیں اور اس کی قادر الکلام کی گواہی دیتی ہیں۔ نصرتی کو بیجاپوری دربار میں عزت اور مرتبہ حاصل تھا جو کسی اور دکنی شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ نصرتیکے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی فرماتے ہیں:

> ''نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادر الکلام کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ گلشن عشق میں انسانی جذبات او خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ اور استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔'' ۲۳

نصرتی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

دنوں شاہزادے دونو ماہ رو　　خوشی سوں رضا لے چلے ملک سوں

مرتب کرن ہار مالا رتن　　کیا ہے دویوں نظم پڑی کہن ۲۴

مذکورہ بالا شاعروں اور نثر نگاروں کے علاوہ عادل شاہی عہد میں اور بہت سے اردو شاعر اور نثار گزرے

ہیں۔جن میں آتشی، آمین، شوقی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی، دولت شاہ ملک، ظہور، ہاشمی، مومن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان بزرگوں کے حالات زندگی اور انکی ادبی کاوشوں کو زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لانے اور انکی تلاش وجستجو کی ضرورت ہے۔ان کے حالات، ادبی کارناموں اور نمونہ؟ کلام کو اس مختصر مضمون میں پیش کرنا ممکن نہیں۔مختصر یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی میں دکنی ہند کا بہت بڑا حصہ ہے۔خاص کر کے عادل شاہی عہد کے ادبی کارناموں کو اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔اس لئے عادل شاہی عہد کو دکنی اردو کا عہد زریں کہنا بجا ہے۔

## حوالہ جات :


(۱) ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، دہلی: اردو کتاب گھر، ۱۹۶۴ء، ص۔۱۴

(۲) اے۔بشیر، صحیفہ ادب، علی گڑھ: انور بک ڈپو، ۱۹۹۷ء، ص۔ ۲۰۱

(۳) عظیم الحق جنیدی، اردو ادب کی تاریخ، علی گڑھ: ایجوکشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص۔ ۵۷

(۴) حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، آگرہ: آگرہ اخبار برقی پریس، ۱۹۳۸ء، ص۔ ۳۲

(۵) صحیفہ ادب، ص۔ ۲۰۴

(۶) ڈاکٹر محی الین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، علی گڑھ: ایجوکشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص۔ ۲۵

(۷) مختصر تاریخ ادب اردو، ص۔۲۲

(۸) نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۲ء، ص۔ ۶۹

(۹) دکن میں اردو۔ص۔۷۰

(۱۰) دکن میں اردو۔ص ۔۱۸۱

(۱۱) ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عباد اللہ، تاریخ ادب اردو، علی گڑھ: ایجوکشنل بک ہاؤس، ۱۹۶۲ء، ص۔ ۱۷۱

(۱۲) دکن میں اردو، ص۔ ۱۸۴

(۱۳) رام بابو سکسینہ، اے ہسٹری آف اردو لٹریچر، الہ آباد: رام نرائن لال پبلشرز، ۱۹۴۰ء، ص۔ ۹۳

(۱۴) سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، لاہور: نول کشور پریس، ۱۹۲۹ء، ص۔ ۱۰

(۱۵) دکن میں اردو، ص۔ ۱۸۵

(۱۶) دکن میں اردو، ص۔ ۱۸۵

(۱۷) عبدالقیوم، تاریخ ادب اردو، کراچی: پاکستان ایجوکشنل پبلشرز لمیٹڈ، ۱۹۶۴ء، ص۔ ۳۸۲

(۱۸) دکن میں اردو، ص۔ ۸۸

(۱۹) دکن میں اردو، ص۔ ۱۸۹

(۲۰) دکن میں اردو، ص۔ ۲۰۸

(۲۱) دکن میں اردو، ص۔ ۲۱۱

(۲۲) پروفیسر نورالحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، علی گڑھ: ایجوکشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص۔ ۷۷

(۲۳) دکن میں اردو، ص۔ ۲۱۴

(۲۴) دکن میں اردو، ص۔ ۲۱۷

# مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

☆ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان وادب کے غیر مطبوعہ مقالات طے کردہ ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ تمام مقالات اشاعت سے قبل Peer Review کے لیے مختلف ماہرین کو بھیجے جاتے ہیں جن کی منظوری کے بعد مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ کیا جائے جو کہ آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں رائج ہیں۔ مقالہ A4 جسامت کے کاغذ پر ایک ہی جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے۔ جس کے متن کا مسطر '۸×۵' انچ میں رکھا جائے۔ حروف نوری نستعلیق میں ہوں جن کی جسامت '۱۴' پوائنٹ ہو۔ مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اسکا خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۱۰۰ الفاظ) اور عنوان شامل کیا جائے۔ مقالے کی CD بھی ساتھ ارسال فرمائیں۔ یعنی مقالے کی ''ہارڈ'' اور ''سوفٹ'' کاپی دونوں ارسال کی جائیں۔

☆ مقالے کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے اور موجودہ عہدہ نیز مکمل پتہ بھی درج کیا جائے۔

☆ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں بالخصوص اردو زبان کے درج ذیل موضوعات پر مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔ تحقیق: لسانیات، تدوین متن و تحقیق متن کے موضوعات، علمی و ادبی مباحث، مطالعہ ادب، تخلیقی ادب کے تنقیدی و تجزیاتی مباحث اور مطالعہ کتب۔

☆ مقالہ میں استعمال ہونے والے تمام حوالہ جات وحواشی کی نمبری ترتیب ایک ہی ہوگی اور مقالہ کے آخر میں حوالہ جات وحواشی درج ذیل طریقے سے دیئے جائیں گے۔

**الف۔ مطبوعہ کتب کا حوالہ:**

وزیر آغاز، ڈاکٹر، ''معنی اور تناظر'' سرگودھا، مکتبہ نردبان، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۶۳

**ب۔ مطبوعہ مقالات کا حوالہ:**

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''صورت و معنی کا رشتہ''، متمولہ ''اردو زبان اور اردو رسم الخط'' مرتب: پروفیسر فتح محمد ملک، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۴۶۱

**ج۔ مجلّہ، جریدہ یا رسالہ میں شامل مقالہ کا حوالہ:**

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''آزاد عالم دیوانگی''، مشمولہ ''تخلیقی ادب'' شمارہ: ۷ جون ۲۰۱۰ء۔ مدیر ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر شیف انجم اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ص ۱۲

**د۔ ترجمہ کا حوالہ:**

سٹیفن ڈبیلو ہاکنگ ''کائنات کی تاریخ''، مترجم یاسر جواد، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء ص۔ ۱۵۵

**ہ۔ اخبار کی کسی تحریر کا حوالہ:**

انور سدید، ڈاکٹر ''شہزاد احمد کی یاد میں''، روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی، ۲۱۔ اگست ۲۰۱۳

**و۔ مکتوب کا حوالہ:**

مکتوب ظہور احمد اعوان بنام نذیر تبسم مورخہ ۱۱۔ اگست ۲۰۰۷ء مشمولہ ''ابن بطوطہ کے خطوط'' لاہور، الوقار پبلیکیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۔ ۲۹۷

**ز۔ انٹرنیٹ، آن لائن دستاویزات کا حوالہ:**

☆ مقالے کے آخر میں کتابیات شامل نہ کی جائیں۔

☆ مندرجات کی تمام تر ذمہ داری محققین پر ہوگی۔

☆ مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' کی ای میل du.urdujournal@gmail.com پر بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔

**প্রকাশিত বইঃ**

ড. মুহাম্মদ শহীদুল্লাহ, *বাঙ্গালা ভাষার ইতিবৃত্ত* (ঢাকা: মাওলা ব্রাদার্স, ১৯৯৮), পৃ. ৪০;

عبدالشکور، حسرت موہانی، (لکھنو: ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۹۵۲)، صفحہ ۷۰۶

P.W.K. Stone, *The Textual History of King Lear* (London: Scholarly Press, 1980), P. 40

**পত্রিকা/ জার্নালঃ**

ড. উম্মে সালমা, 'উর্দুর কয়েকজন ছোটগল্প লেখক-লেখিকা', *সাহিত্য পত্রিকা* সম্পাঃ রফিকুল ইসলাম), ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়, আটত্রিশ বর্ষ: দ্বিতীয় সংখ্যা, ফাল্গুন ১৪০১, পৃ. ৩১

کے.ایم.اشرف، 'غالب اور بغاوت ۱۸۵۷'، انقلاب الٹھارہ سو ستاون (مرتب: پی سی جوشی) (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، چوتھی طباعت، ۲۰۰۹)، ص ۲۶۶

C.C. Haselgrove, 'The archeology of British Potin Coinage', *Archaeological Journal*, Volume-145 (1888), P. 99-104.

৮. মূল পাঠের মধ্যে উদ্ধৃতি তিন লাইনের বেশি হলে পৃথক অনুচ্ছেদে ডানে বামে ১৫ মি.মি. ফাঁক রেখে তা উপস্থাপন করতে হবে। কবিতার উদ্ধৃতিতে মূলের পংক্তি-বিন্যাস অক্ষুন্ন থাকবে।

৯. মূল পাঠে অপরিচিত বিদেশী শব্দ থাকলে তা বিদেশী শব্দ উর্দু লিপিতে বর্ণীকরণের (Transcription) নিয়ম অনুযায়ী লিখতে হবে। ব্যক্তি ও বইয়ের নাম উর্দুর পর প্রথম বন্ধনীর মধ্যে ইংরেজী ভাষায় লিখতে হবে।

১০. গ্রন্থের একাধিক লেখক থাকলে তথ্যনির্দেশে সকলের নাম উল্লেখ থাকতে হবে।

১১. প্রবন্ধ শেষে টীকা ও তথ্যসূত্র ব্যবহার করতে হবে।

১২. প্রবন্ধের বিষয়বস্তুতে দ্বৈত লেখকের প্রয়োজন না হলে একই প্রবন্ধে দ্বৈত লেখক গ্রহণযোগ্য নয়।

লেখা পাঠানোর ঠিকানাঃ

সম্পাদক

*ঢাকা ইউনিভার্সিটি জার্নাল অফ উর্দু*

উর্দু বিভাগ, ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়

du.urdujournal@gmail.com

# লেখা পাঠানোর নিয়মাবলী

*'ঢাকা ইউনিভার্সিটি জার্নাল অফ উর্দু'* জার্নালে বিভিন্ন বিষয়ে উর্দু ভাষায় রচিত মৌলিক গবেষণা-প্রবন্ধ প্রকাশিত হয়।

পত্রিকায় লেখা পাঠানো বা জমা দেয়ার নিয়ম নিম্নরূপ:

১.পাণ্ডুলিপি কম্পিউটার কম্পোজ করে দুই কপি প্রিন্ট কপি জমা দিতে হবে। সাথে সিডি রাইট করে অথবা পেন ড্রাইভে করে সফ্‌ট কপি জমা দিতে হবে।

উর্দু Inpage সফ্‌টওয়্যার ব্যবহার করতে হবে। টাইপ ফন্ট Noori Nastaliq ব্যবহার করতে হবে।

কাগজের সাইজ A4। প্রতি পৃষ্ঠায় মার্জিন থাকবে উপরে ২ ইঞ্চি, নিচে ২ ইঞ্চি, ডানে ১.৬৫ ইঞ্চি এবং বামে ১.৬৫ ইঞ্চি।

২. প্রবন্ধে লেখকের নাম, পেশাগত পরিচয় ও ঠিকানা আলাদা কাগজে থাকবে। লেখক কোন কলেজ/ মাদরাসা/ বিশ্ববিদ্যালয়ের নূন্যতম প্রভাষক অথবা কোন গবেষণা প্রতিষ্ঠানের অধীনে গবেষণায় নিয়োজিত থাকতে হবে। বিভাগীয় ছাত্র-ছাত্রীদের ক্ষেত্রে এ শর্ত শিথিলযোগ্য।

৩. প্রত্যেক প্রবন্ধের সাথে লেখককে এ মর্মে একটি প্রত্যয়নপত্র জমা দিতে হবে যে-

জমাকৃত প্রবন্ধের লেখক তিনি নিজেই
এটি একটি মৌলিক গবেষণা প্রবন্ধ
প্রবন্ধটি ইতোপূর্বে অন্য কোন পত্রিকায় মুদ্রিত হয়নি কিংবা প্রকাশের জন্য অন্য কোন জার্নালে জমা দেয়া হয়নি।
এ প্রবন্ধ বিষয়ক সকল দায়িত্ব লেখক বহন করবেন।

৪. প্রকাশের জন্য মনোনীত কিংবা অমনোনীত কোন পাণ্ডুলিপি ফেরত দেয়া হবে না। প্রবন্ধ প্রকাশিত হলে লেখক জার্নালের ৫ কপি সৌজন্য হিসেবে পাবেন।

৫. উদ্ধৃতির ক্ষেত্রে মূল বানানের পরিবর্তন হবে না। লেখক কোন বিশেষ বানান-বৈশিষ্ট্য রক্ষায় আগ্রহী হলে তা অক্ষুন্ন রাখা হবে।

৬. তথ্যনির্দেশ ও টীকার জন্য শব্দের উপর অধিলিপিতে (Super Script) সংখ্যা ব্যবহার করতে হবে ( যেমন:[১] )।

৭. তথ্যনির্দেশে লেখক বা লেখকগণের পূর্ণ নাম থাকবে। বই ও পত্রিকার নাম বাঁকা (Italic) অক্ষরে হবে। বই ও পত্রিকার উৎস দেখানোর সময় অনুসরণীয় নীতি হল:

8. Dr. Rayhan Hussain
   Hindustan Mein Ekiswi Sadi Ke Numaendah Adabi Rasayal

9. Dr. Md. Alamgir Hussain
   Ghalib Ka Urdu Qasayed : Ek Mukhtasar Jayezah

10. Md. Golam Mawla
    Hasrat Muhani Ki Shayeri Mein Siyasi Afkar

11. Professor Md. Mansoor Alam
    Sufi Fateh Ali Waisi ki shayeri me akhlaqi aqdar ka tasawwor

12. Professor Dr. Nasir Uddin
    Adil Shahi Ahad Mein Adab : Ek Mukhtasar Jayezah

# Contants

1. Abul Barakat Jilani
Abdul Gafur Nassakh : Hayat Aur Fan

2. Professor Dr. Md. Israfil
Dhaka Ke Chand Urdu Shuara

3. Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuiyan
Urdu Adab Ki Ebtadaye Nashru-o-Numa Mein Dakan Ki Adabi Khidmat Ka Jayejah

4. Husynul Banna
Iqbal Ka Najriya-e-Ishtarakiyat

5. Hafsa Akter
Turkey Ke Urdu Dost Halil Toker Ki Shayeri Ka Fanni Tazjiah

6. Dr. Rashid Ahmad
Bangladesh Mein Foruge Urdu Mein Madaris ka Kirdar : Masayal Aur Imkanat

7. Dr. Md. Rezaul Karim
Urdu Nasar ki Taraqqi Mein Fort William College Ke Monshiuon ka Hissah

# Dhaka University Journal of Urdu

**Year : 2013** **Volume : 6**

Year of Publication : 2020

## Editor

**Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuiyan**

## Associate Editor

**Professor Dr. Md Israfil**

## Editorial Board

Dean, Faculty of Arts, University of Dhaka
Professor Dr. Md. Mahmudul Islam
Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani
Professor Dr. Kulsoom Abul Bashar
Professor Dr. Mohammad Abdur Rashid

**Department of Urdu**

**University of Dhaka, Bangladesh**

# Dhaka University Journal of Urdu

**Year : 2013** **Volume : 6**

Published by : The Registrar
University of Dhaka
Dhaka-1000

Printed by : Boishakhi Creation
86, Purana Paltan, Dhaka

Price : Tk - 100/= (One Dollar)

Year of Publication : March 2020

Correspondence Address : **Editor**
Dhaka University Journal of Urdu
Department of Urdu
University of Dhaka
Dhaka- 1000

E-mail : du.urdujournal@gmail.com

# Dhaka University Journal of Urdu

**Year : 2013** **Volume : 6**

**Year of Publication : March 2020**

**Department of Urdu**
**University of Dhaka**
**Bangladesh**

# Dhaka University Journal of Urdu

Year: 2013 Volume: 6




Department of Urdu
University of Dhaka ■ Bangladesh